پھر چلا مسافر

بھارت کے چار سفر

حصہ چہارم

ڈاکٹر محمد مشتاق احمد مانگٹ

پھر چلا مسافر

بھارت کے چار سفر

ان جگہوں کو دیکھنے کے لیے جن سے میرا ماضی جڑا ہوا ہے!

(حصہ چہارم)

ڈاکٹر محمد مشتاق احمد مانگٹ

AASIM PUBLICATIONS
LAHORE - PAKISTAN

پھر چلا مسافر:
بھارت کے چار سفر (حصہ چہارم)

ڈاکٹر محمد مشتاق احمد مانگٹ
mushtaq.mangat@gmail.com

اہتمام اشاعت : وقار ندیم احمد

اشاعت اول : 2022ء

ایڈیٹنگ : اویس ضیار

ٹائیٹل : مسز سُندس اویس

پرنٹرز : تسکینِ ذوق پرنٹرز، لاہور

PHIR CHALA MUSAFIR
Bharat Ke Char Safar (Part-Four)
Dr. Muhammad Mushtaq Ahmad Mangat

Published by:
Aasim Publications
296-B, Revenue Employees Cooperative
Housing Society, Lahore - Pakistan.

یہ کتاب ای بک کی شکل میں انٹرنیٹ پر رکھی گئی ہے۔ آپ اسے ڈاؤنلوڈ کر سکتے ہیں اور کسی کو بھی دے سکتے ہیں۔ اس کتاب کی فروخت سے حاصل ہونے والی تمام تر آمدنی غزالی ایجوکیشن ٹرسٹ میں تعلیم حاصل کرنے والے ضرورت مند طالبعلموں کی تعلیمی ضروریات پوری کرنے کیلئے خرچ کی جاتی ہے۔ یہ کتاب درج ذیل ویب سائٹ پر موجود ہے۔

https://taawun.org.pk/downloads/, and www.scribd.com

انتساب

محمد یوسف مانگٹ بن عاصم الٰہی مانگٹ کے نام

جو ہم سب کی زندگی کا محور ہے

ترتیب مضامین

بھارت کا چوتھا سفر

حرفِ آغاز

میں نے بھارت کا پہلا دورہ جولائی 1996ء میں کیا، اس دورے پر میں اکیلا ہی تھا۔ دوسرا دورہ فروری 1999ء میں کیا، اس وقت سیّد وقاص انجم جعفری صاحب اور شیخ عمر فاروق صاحب میرے ہمراہی تھے۔ میں نے تیسرا دورہ اگست 2000ء میں کیا، جس میں سیّد رفیق انجم جعفری صاحب (وقاص جعفری صاحب کے والد صاحب) اور ساجد منظور میرے ساتھ تھے۔ ان تمام سفروں کی روداد میں حصہ اول، حصہ دوم اور حصہ سوم میں لکھ چکا ہوں۔

چوتھی مرتبہ جون 2005ء میں، میں اور ڈاکٹر عرفان شیخ صاحب یونیورسٹی آف مینجمینٹ اینڈ ٹیکنالوجی لاہور کے طلبہ کا ایک وفد لے کر بھارت گئے۔ حصہ چہارم میں چوتھے دورے کی روداد بیان کی جائے گی۔

میں 2005ء میں یونیورسٹی آف مینجمنٹ اینڈ ٹیکنالوجی لاہور کے ٹیکسٹائل ڈیپارٹمنٹ میں اپنے فرائض سرانجام دے رہا تھا۔ میرے ساتھ نہایت عزیز دوست عرفان شیخ صاحب بھی تھے۔ میں نے ایک دن، ان سے کہا کہ کیوں نا ہم بھارت کا دورہ کریں؟ وہ بھی گھومنے پھرنے کی شوقین ہیں انھوں نے جلد ہی ہاں کر دی۔ ٹیکسٹائل ڈیپارٹمنٹ کے بچوں سے بات کی ان میں سے بھی کچھ طالب علم ہمارے ساتھ جانے کو تیار ہو گئے۔

یونیورسٹی انتظامیہ سے رابطہ کیا تو انھوں نے کہا کہ بھارت اور پاکستان کے درمیان تعلقات کو دیکھتے ہوئے ہم آپ کو یونیورسٹی کی طرف سے کوئی بھی مدد فراہم نہیں کر سکتے۔ آپ اپنی ذاتی حیثیت میں جانا چاہتے ہیں تو کوئی اعتراض نہیں۔ وہ سب دیکھنے کے بعد ہم نے اسے اپنا ذاتی دورہ ہی بنایا۔

ٹیکسٹائل ڈیپارٹمنٹ کے علاوہ بھی ایک اور طالب علم تیار ہو گیا۔ اسطرح نو طالب علموں اور دو اساتذہ پر مشتمل ایک وفد ترتیب دیا گیا جس نے 7 جون 2005ء سے 15 جون 2005ء تک بھارت کا سفر کیا۔ ہمارا یہ سفر لاہور سے دہلی تک بذریعہ دوستی بس تھا اور واپسی بھی بس کے ذریعے ہی تھی۔

اس سفر کے لیے ہم نے دہلی میں موجود ناردرن انڈین ریسرچ ٹیکسٹائل انسیٹیوٹ سے رابطہ کیا اور ان سے ایک خط منگوایا جس کی بنیاد پر پاکستان میں موجود بھارتی سفارتخانے نے ہمارا ویزا لگایا۔ اس سفر میں ہم نے دہلی کے تاریخی مقامات کے علاوہ آگرہ بھی دیکھا۔ تاج محل کے دیدار کے بغیر یقینی طور پر وہ ہمارا سفر ادھورا تھا۔ میں اس سے پہلے بھی ایک مرتبہ تاج محل دیکھ چکا تھا لیکن تاج محل کی بات ہی کچھ اور ہے۔

اس کے متعلق تو یہی کہا جا سکتا ہے کہ

ہے یہ دیکھنے کی چیز اسے بار بار دیکھ

اس دورے میں ہم نے آئی آئی ٹی دہلی کے ٹیکسٹائل ڈیپارٹمنٹ کا بھی دورہ کیا۔ ناردرن انڈین ٹیکسٹائل انسیٹیوٹ میں بھی ہم نے کافی وقت گزارا۔ اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے ہمارے لیے کئی ملز کے وزٹس کا بھی اہتمام کر رکھا تھا۔ اس لیے ہمیں کئی ٹیکسٹائل ملز دیکھنے کا بھی موقع ملا۔ وہاں پر جو کچھ ہو رہا تھا، ہم نے اس کا اپنے ہاں کی ملوں سے موازنہ کیا جو ہمارے لیے بے حد مفید تھا۔ وہ تفریحی اور تعلیمی دورہ اس وقت تک ہماری یونیورسٹی کی تاریخ کا واحد بھارتی دورہ ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ دورہ یونیورسٹی کی طرف سے نہیں تھا بلکہ ذاتی حیثیت سے کیا گیا دورہ تھا۔ اس سفر کی سب سے اہم بات یہ تھی کہ ہمیں لاہور سے دلی تک کا سفر بذریعہ بس کرنا تھا جس سے ہمیں بھارتی پنجاب کو بھی قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔

اس سفر کی روداد پیش خدمت ہے۔ یہ ان چار سفروں میں سے ایک ہے جس کی روداد دو چار حصوں میں لکھی گئی اور یہ اس کا آخری حصہ ہے۔ پچھلے کئی سالوں سے میں نے دوبارہ بھارت جانے کے لیے کوشش کی اور اس کے باوجود کہ ہم بھارت سے تجارتی پابندیوں سے قبل ایک بڑی مقدار میں رنگ منگواتے تھے، بھارتی حکومت نے مجھے ویزا نہیں دیا۔ اس لیے باوجود خواہش کے میں دوبارہ بھارت نہ جا سکا۔

میری خواہش ہے کہ اگر مجھے موقع ملا تو میں بھارت کے مشرقی حصے کو ضرور دیکھوں جس میں سرفہرست کلکتہ ہے۔ اللہ کرے کہ دونوں ممالک کے درمیان تعلقات میں بہتری آئے کیونکہ تب ہی ایسا ممکن ہے اور اس کام کے لیے صرف دعا ہی کی جا سکتی ہے۔

سفر کے تمام تر انتظامات کرنے کے بعد ہم سب نے مل کر یہ دعا کی کہ اللہ تعالی ہمارا یہ سفر بخیر و خوبی مکمل فرمائے۔

جب آپ بڑے ہوں اور آپ کے ساتھ بچے ہوں تو آپ کی ذمہ داری اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ ذہن میں مختلف خیالات آتے رہتے ہیں کہ اللہ نہ کرے کوئی ان ہونی ہو جائے۔

یہ کتاب اس نقطہ نظر سے لکھی گئی کہ جہاں بھی سفر کیا گیا وہاں کی تاریخی، معاشرتی، معاشی، مذہبی، سیاسی، تمدنی اور جدید معلومات کے علاوہ دیگر اہم واقعات کا بھی ایک ہی جگہ احاطہ کیا جا سکے۔

اس کام کے لیے مجھے تقریبا تین سال سے زائد کا عرصہ لگا۔ میری یہ کوشش رہی ہے کہ میں اپنی ذاتی رائے سے زیادہ حقیقی کرداروں اور مستند کتب کا حوالہ آپکے سامنے

پیش کروں تاکہ جانبداری کا عنصر حذف ہوسکے اور میں اس میں کس حد تک کامیاب رہا ہوں، یہ فیصلہ آپ کو کرنا ہے۔

اس کتاب کو مزید بہتر کرنے کے لئے میں آپ کی آراء کا منتظر ہوں اور اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالی میری اس کوشش کو صدقہ جاریہ بنائے۔

آمین ثم آمین

بصد ادب، احترام اور محبت کے ساتھ

ڈاکٹر محمد مشتاق احمد مانگٹ

مئی 2022

بھارت آمد بذریعہ بس

ہم سات جون 2005ء کو صبح چھ بجے سے پہلے لبرٹی مارکیٹ لاہور کے قریب ایک جگہ، جہاں سے دوستی بس روانہ ہوتی تھی پہنچ گئے۔ حسب معمول حفاظتی نقطہ نظر سے وہاں پولیس کا ایک دستہ بھی موجود تھا۔ اس دستے نے ہمیں واہگہ بارڈر تک پہنچایا۔ میں نے زندگی میں پہلی مرتبہ ایسا سفر کیا جس میں ہماری سواری، یعنی ہماری بس کے آگے ایک ہوٹر بجاتی پولیس گاڑی چل رہی تھی۔ بھارت میں بھی ہمارا سارا سفر اسی طرح سے ہوا۔ حفاظتی نقطہ نظر سے ہر چوک میں ٹریفک سگنل بند کر کے ہماری بس کو گزارہ گیا۔ ہر وقت ہمارے آگے ہوٹر بجاتی پولیس کی گاڑی چلتی رہی۔ جیسے ہی ہم دہلی پہنچے تو ہماری حفاظت کرنے والی پولیس کی ذمہ داری بھی ختم ہو گئی۔

مجھے پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ پولیس کی ہوٹر بجاتی گاڑی کی موجودگی بھی ایک نشے کی مانند ہی ہے۔

Dosti Bus Service Photo Credit:

https://www.tribuneindia.com

بس میں زیادہ تر پاکستانی تھے اور شاید ان میں سے کچھ ایسے مسلمان بھی تھے جو بھارت سے پاکستان اپنے رشتہ داروں سے ملنے آئے تھے لیکن ان کی پہچان مشکل تھی۔ بس میں سوار ہونے سے قبل ہم سب کی مناسب تلاشی لی گئی اور سامان کی بھی جانچ پڑتال کی گئی۔

بس وقت مقررہ پر چلی اور ہم واہگہ باڈر پہنچ گئے۔ واہگہ بارڈر تک پہنچتے پہنچتے تقریباسات بج چکے تھے۔ وہاں پر ہمارے لیے ایک بہت ہی پر تکلف ناشتے کا بندوبست کیا گیا تھا۔ واہگہ باڈر کی طرف سے پاکستان امیگریشن نے ہمارے پاسپورٹ چیک کیے اور ان پر مہریں لگائیں۔ ہماری بس سے سامان نیچے اتارا گیا اور وہاں پر موجود مزدوروں کی مدد سے وہ سامان بھارت کی طرف موجود ایک شیڈ کے نیچے پہنچایا گیا ہمیں بھی پیدل ایک طرف سے دوسری طرف جانا پڑا۔

درمیان میں ایک لائن تھی 1947ء میں لگائی گئی تھی اور اس لائن کو پاکستان اور بھارت کے درمیان ایک سرحد کا درجہ دیا گیا۔ یہ لائن دونوں ممالک کے لیے بے حد اہم بلکہ مقدس مانی جاتی ہے۔ کوئی بھی ریاست کی مرضی کے بغیر اس لائن کو عبور نہیں کر سکتا۔

ہم لائن عبور کرکے دوسری طرف چلے گئے۔۔۔ وہ بھارت کی سرزمین پر میرے علاوہ سب کا پہلا قدم تھا۔ میرا یہ چوتھا قدم تھا۔۔۔ لیکن بذریعہ بس پہلا سفر تھا۔

وہاں پر تشریف فرما بھارتی عملے جن میں اکثریت سکھ لوگوں کی تھی نے ہمیں خوش آمدید کا اور ہمارے پاسپورٹ چیک کرکے کر دوبارہ بس میں جانے کی اجازت دی گئی۔ سامان کی دوبارہ سے جانچ پڑتال کی گئی۔

اب ہم بھارت میں تھے، سب بچے بے حد پر جوش اور خوش تھے لیکن عرفان صاحب خوش بھی تھے اور ساتھ ساتھ ایک بڑی ذمہ داری بھی محسوس کر رہے تھے۔

دوستی بس: جو بیس سال بعد بند کر دی گئی

دہلی-لاہور بس، جسے دوستی بس کہا جاتا ہے، کا آغاز 19 فروری 1999ء کو کیا گیا۔ بھارت کے اس وقت کے وزیر اعظم اٹل بہاری واجپائی اسی بس میں سوار ہو کر ایک سربراہی اجلاس میں شرکت کرنے لاہور آئے تھے اور واہگہ بارڈر پر پاکستانی وزیرِ اعظم نواز شریف نے ان کا استقبال کیا تھا۔ پھر حالات بدلے اور پاکستان نے بھارتی حکومت کی طرف سے جموں و کشمیر کی خصوصی حیثیت ختم کرنے پر بطور احتجاج یہ بس سروس بند کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس کے علاوہ بھی اس بس کو کئی مرتبہ روکا گیا لیکن اب پچھلے دو سال سے یہ مکمل طور پر بند ہے۔

دوستی بس ہفتے میں تین دن چلتی تھی اور اس کا کرایہ بھی مناسب تھا۔ لاہور سے دہلی 410 کلومیٹر دور ہے اور دوستی بس یہ فاصلہ سولہ گھنٹے میں طے کرتی تھی۔ اس سفر کے لیے، پاکستان اور بھارت، دونوں طرف کی بسیں باری باری چلتی تھیں۔ اب تو یہ بس ماضی کا قصہ بنی ہوئی ہے۔ اگر حالات ٹھیک ہوئے تو امید کی جا سکتی ہے کہ اس بس کا دوبارہ آغاز ہو جائے گا۔

اللہ کرے کہ ایسا ہو تاکہ لوگ اپنے عزیز و اقارب سے باآسانی سے مل سکیں!

Wahga Border Daily Parade Photo Credit:
https://www.youlinmagazine.com

اٹاری: بھارت کا پہلا قصبہ

سرحد کے ساتھ ہی ایک بڑا کمپلکس تھا جہاں امیگریشن اور کسٹم کے دفاتر تھے۔ پاکستان کی طرف سے بارڈر کو واہگہ جبکہ بھارت میں اسے اٹاری بارڈر کہا جاتا ہے۔ وہاں اٹاری کے نام سے ایک ریلوے سٹیشن بھی ہے۔ پاکستان کی طرف واہگہ نام کا ایک گاؤں ہے جس کی وجہ سے اسے واہگہ بارڈر کہا جاتا ہے، واہگہ ایک ذات کا نام بھی ہے جو شاید جاٹوں کی ایک گوت ہے، جبکہ بھارت کی طرف ایک بڑے قصبے کا نام اٹاری ہے۔ جس کی وجہ سے اسے اٹاری بارڈر کہا جاتا ہے۔

رنجیت سنگھ کے دور میں ملتان کی مشہور لڑائی ،جو رنجیت سنگھ اور نواب مظفر خان سدوزئی کے درمیان ہوئی جس میں سکھوں کو فتح ہوئی تھی اور اس طرح ان کا ملتان پر قبضہ ہو گیا تھا۔ اس جنگ کی تاریخ میں، آپ نے ایک سکھ جرنیل سردار شام سنگھ اٹاری والا کا نام ضرور پڑھا ہو گا۔ سردار شام سنگھ اٹاری والا کا سکھوں کی تاریخ میں ایک اہم مقام ہے۔ جس کا تذکرہ میں آئندہ صفحات میں کروں گا۔ فی الحال میں آپ کے سامنے پنجاب

کے اس آخری قصبہ سے متعلق چند باتیں پیش کرنا چاہتا ہوں۔ اس سے آپ کو اندازہ ہو گا یہ قصبہ کس قدر تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔

جب ہماری بس اٹاری قصبے سے گزر رہی تھی تو میں نے دیکھا کہ اٹاری کے بازار اور باٹا پور پاکستان کے بازار میں کوئی فرق نہیں تھا۔ صرف ایک ہی فرق محسوس ہوتا تھا کہ اٹاری میں پگڑی پہنے سکھوں کی ایک بڑی تعداد موجود تھی۔ لوگوں کے قد کاٹھ، شکل صورت اور زبان میں کوئی فرق محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ میں نے اپنے پاس تاریخ کی ایک کتاب بھی سنبھال رکھی تھی جس سے میں کسی بھی قصبے کے آنے سے پہلے اس کی تاریخ جاننے کی کوشش کرتا تھا۔ اس سے مجھے اس قصبے سے دلچسپی بھی پیدا ہوتی تھی۔ ایسا کرنے سے سیاحت کے ساتھ ساتھ میری معلومات میں بھی اضافہ ہوتا تھا۔

اٹاری، بارڈر سے تین کلومیٹر کے فاصلے پر ہے جبکہ امرتسر سے اس کا فاصلہ پچیس کلومیٹر ہے بھارت کی طرف سے یہ ان کا آخری قصبہ ہے۔ اس کی تاریخ جانتے ہوئے یہ پتہ چلا کہ یہ ماجھا کے علاقے کا ایک اہم شہر ہے۔

اٹاری اور سردار شام سنگھ اٹاری والا

اٹاری کی تاریخ پڑھتے ہوئے معلوم ہوا کہ سدھو جاٹ خاندان کے دو سکھ بھائیوں، جن کے نام گور سنگھ اور کور سنگھ تھے، نے اٹھارویں صدی کے آغاز میں اس گاؤں کی بنیاد رکھی۔ وہ چوہدری کاہن سنگھ سدھو کے بیٹے تھے۔ چودھری کاہن سنگھ کا تعلق لدھیانہ سے تھا جو مالوا کے علاقے کا ایک اہم شہر تھا۔ تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ پنجاب کو کئی علاقوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ پنجاب کے وسطی علاقوں کو بار کہا گیا جیسے نیلی بار، ساندل بار وغیرہ۔ اسی طرح سے اس کے شمالی علاقوں کو بھی تین بڑے علاقوں، ماجھا، مالوا اور دوآبہ، میں تقسیم کیا گیا۔

SHAM SINGH
ATARIWALA JI

Photo Credit: http://www.discoversikhism.com|
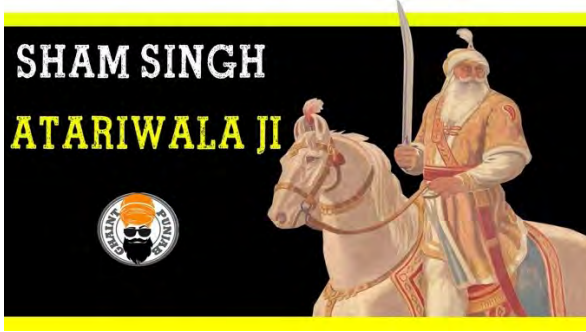
ماجھا کا علاقہ دریائے ستلج سے شروع ہو کر دریائے جہلم تک موجود ہے۔ اس علاقے کے مشہور شہر امرتسر، لاہور، گجرات اور گوجرانوالہ ہیں۔ دریائے ستلج اور دریائے بیاس کے درمیانی علاقے کو

دوآبہ کہا جاتا ہے۔ ہشیارپور، کپورتھلہ، جالندھر اور شہید بھگت سنگھ نگر اس کے اہم شہر ہیں۔۔

تیسرا علاقہ مالوا کہلاتا ہے جو لدھیانہ سے انبالہ تک ہے۔ اس کے مشہور شہر فتح گڑھ صاحب، پٹیالہ اور بٹھینڈا ہیں۔ اس کے علاوہ بھی کئی طرح سے پنجاب کی تقسیم کی جاتی تھی۔ جیسے راوی دوآبہ کا علاقہ جو ستلج اور راوی کے درمیان واقع ہے۔ میرے علم کے مطابق ان مختلف علاقوں کی تقسیم کرتے ہوئے دریا کو ہی سرحد مانا جاتا تھا جو کہ ایک قدرتی سرحد سمجھی جاتی تھی اور پہاڑی علاقوں میں پہاڑ کو ایک قدرتی سرحد کے طور پر لیا جاتا تھا۔

اٹاری بسانے والے دونوں بھائی مالوا سے آئے تھے۔ انھوں نے ستلج کے اس پار اس علاقے میں ایک گاؤں آباد کیا۔ شروع میں اسکے کئی نام رکھے گئے اور بعد میں انھوں نے یہاں پر ایک تین منزلہ حویلی بھی بنائی جس کی وجہ سے اسے اٹاری کا نام دیا

گیا۔ ان دونوں بھائیوں نے مغلوں کے خلاف کئی گوریلا جنگیں بھی لڑیں۔ جس سے وہ بہت ہی مشہور ہوئے۔ وہ دونوں بعد میں سکھوں کی بھنگی مثل میں شامل ہو گئے۔ یاد رہے اٹاری کا قصبہ مشہور زمانہ جی ٹی روڈ پر واقع ہے۔ دہلی اور لاہور کے درمیان تمام تر قافلے اسی راستے سے جاتے تھے۔ یہاں کے لوگوں نے رنجیت سنگھ کا مقابلہ بھی کیا۔ ان کا والد رنجیت سنگھ کا ایک وفادار جرنیل تھا۔

میرے علم کے مطابق برصغیر پاک و ہند میں اس علاقے کے لوگ، جن کا تعلق جاٹ برادری سے تھا، وہ آخری لوگ تھے جو انگریزوں کے ساتھ آخری دم تک جنگ کرتے رہے۔ یہ لوگ ہندوستان پر قبضہ میں آخری رکاوٹ تھے۔ 1849ء پنجاب کی فتح کے ساتھ ہی ہندوستان پر انگریزوں کا مکمل قبضہ ہو گیا۔

میں نے پچھلے صفحات میں یہ بھی ذکر کیا تھا کہ انگریزوں نے 1862ء میں اس علاقے میں پہلی ریلوے لائن، لاہور اور امرتسر کے درمیان بچھائی تھی۔ مختلف انگریز تاریخ دانوں نے پنجاب کی تاریخ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان کے نزدیک اٹاری کے لوگ ہندوستان بھر میں سب سے زیادہ بہادر، دلیر اور جنگجو ہیں۔ جب ہندوستان اور پاکستان کے درمیان سمجھوتہ ایکسپریس ریل کا آغاز ہوا تو اٹاری کی اہمیت میں بے حد اضافہ ہوا۔ اس وقت یہ جگہ پاکستان اور بھارت کے درمیان تجارت کے لیے بے حد اہم ہے۔ یاد رہے بھارت کی افغانستان سے تجارت میں بھی اٹاری کا اہم کردار ہے۔

اب ایک مختصر ذکر سردار شام سنگھ اٹاری والا کا جو 1790ء میں اسی گاؤں میں پیدا ہوا تھا اس کے نام کی ایک یادگار بھی اٹاری میں بنائی گئی ہے۔ اس کی بہادری پر کئی شاعروں نے نظمیں بھی لکھی ہیں۔

میں نے جب سردار شام سنگھ کے بارے میں پڑھا تو مجھے معلوم ہوا کہ بچپن میں اسے گرمکھی اور فارسی کی تعلیم دی گئی تھی جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس علاقے میں فارسی کی تعلیم کا چرچا عام تھا۔ رنجیت سنگھ کے دربار کی زبان بھی فارسی ہی تھی۔ سردار شام سنگھ اٹاری والا اپنے والد کی وفات کے بعد رنجیت سنگھ کی فوج میں بھرتی ہو گیا۔ اس نے رنجیت سنگھ کی خاطر بے شمار جنگیں لڑیں۔ جن میں اہم ترین جنگیں ملتان میں سردار مظفر خان سدوزئی کے خلاف، افغانیوں کے خلاف، اٹک اور پشاور کی جنگیں اور کشمیر کی مہم شامل ہیں۔ ان جنگوں میں رنجیت سنگھ کو فتح ہوئی۔ رنجیت سنگھ نے اسے پانچ ہزار گھڑ سواروں کا سردار بھی بنایا تھا۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بہادر اور قابل سردار تھا۔ اس کی بیٹی کی شادی رنجیت سنگھ کے پوتے کے ساتھ ہوئی تھی۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ رنجیت سنگھ کے خاندان کے بھی انتہائی قریب تھا۔ رنجیت سنگھ کی وفات کے بعد جب اس کی فوج نے ایک طرح سے بغاوت کر دی تو رانی جنداں، رنجیت سنگھ کی بیوی، جسے رانی جند کور بھی کہا جاتا ہے، نے سردار شام سنگھ اٹاری والا کو مدد کے لیے بلوایا۔ یہ ایک الگ داستان ہے کہ کس طرح سردار شام سنگھ اٹاری والا نے باغی فوجیوں کا مقابلہ کیا اور سردار شام سنگھ کی بیوی، مائی داسی نے سردار شام سنگھ کی موت پر شادی کے لباس میں ستی کی رسم ادا کی تھی۔

سوبراؤں میں انگریز اور سکھوں کی ایک اہم جنگ، لاہور پر قبضہ اور کشمیر کا سودا

آپ نے بھی یہ بات بارہا پڑھی ہو گی کہ انگریزوں نے کشمیر کو ایک معمولی رقم کے بدلے راجہ گلاب سنگھ کو بیچ دیا تھا۔ میں مدت سے اس بات کی تلاش میں تھا کہ یہ جان سکوں کہ ایسا کیوں ہوا؟ انگریز پچھلے تین سو سال سے ہندوستان میں تھے اور انھوں نے کہیں بھی ایسا نہیں کیا کہ کوئی علاقہ فتح کیا ہوا علاقہ بعد میں کسی کو فروخت کر دیا ہو۔

جب میں نے اٹاری سے متعلق پڑھا اور سردار شام سنگھ کی داستان جاننے کو ملی تو مجھے یہ علم ہوا کہ پہلی مرتبہ کب انگریز کب بطور فاتح لاہور میں داخل ہوئے اور کیوں انھوں نے کشمیر ایک ہندو راجا کو بیچا۔ اس پوری داستان میں سردار شام سنگھ کا بھی اہم کردار تھا۔ اس وجہ سے میں نے مناسب جانا کہ ایک گاؤں (جس کا نام سوبراؤں ہے) کے بارے میں معلومات حاصل کروں جو ضلع ترن تاران میں دریائے ستلج کے جنوب میں واقع ہے۔ اس گاؤں کے قریب ہی 10 فروری 1846ء کو انگریزوں اور سکھوں کی ایک اہم لڑائی بھی ہوئی۔

یاد رہے اس وقت ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کی ہی حکومت تھی۔ اس سے پہلے بھی سکھوں اور انگریزوں کی کئی لڑائیاں ہو چکیں تھیں۔ اس کے بعد بھی سکھ مزاحمت کرتے رہے۔ 1849ء میں کھاریاں کے علاقے میں آخری جنگ ہوئی۔ ان سب جنگوں کا احوال سید محمد لطیف نے اپنی کتاب "پنجاب کی تاریخ" میں تفصیل سے ذکر کیا ہے۔

اس جنگ کی تاریخ جاننے کے بارے میں مجھے دو چیزوں کی وجہ سے شوق پیدا ہوا۔ ایک یہ کہ اس جنگ کے نتیجے میں انگریزوں کا لاہور پر قبضہ ہوا اور دوسرا یہ کہ اس جنگ کے نتیجے میں کشمیری مسلمان ہندوؤں کے غلام بن گئے۔ انگریزوں نے سکھوں کی ریاست پنجاب پر قبضہ کرکے اس کا ایک خوبصورت حصہ، کشمیر گلاب سنگھ کو فروخت کر دیا اور آج تک اس "کاروبار" کی سزا کشمیر کے مسلمان بھگت رہے ہیں۔ اس جنگ کا مختصر احوال پیش خدمت ہے۔

سوبراؤں گاؤں اٹاری کے جنوب میں چالیس کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ اٹاری کے سردار شیر سنگھ نے بھی اس جنگ میں اہم کردار ادا کیا۔ رنجیت سنگھ نے انگریزوں کے ساتھ اچھے تعلقات قائم رکھے اور انھیں ہر طرح کی مدد بھی پہنچائی۔ یاد رہے جب تک رنجیت سنگھ زندہ رہا اس وقت تک انگریزوں نے دریائے ستلج کو عبور نہیں

کیااور نہ ہی کوئی افغان ہندوستان پر حملہ آور ہوا، بلکہ اس کے الٹ ہوا۔ رنجیت سنگھ نے شمال مغربی ہندوستان کے ساتھ ساتھ افغانستان پر بھی کامیاب حملے کیے اور جمرود تک کا ایک بڑا علاقہ فتح کیا۔ جمرود میں واقع قلعہ اسی دور کی یاد میں بنایا گیا تھا۔ میرے علم کے مطابق سکھوں کی وہ سب سے بڑی ریاست تھی۔ اس سے پہلے اور نہ ہی اس کے بعد کبھی سکھوں کا اتنے بڑے علاقے پر قبضہ رہا ہے۔

سکھ خالصہ فوج اور انگریزوں کے درمیان کئی لڑائیاں لڑی گئیں جن میں سے اکثر میں انگریزوں کو فتح ہوئی۔ اسی سلسلے کی ایک اہم جنگ دریائے ستلج کے کنارے سوبراؤں گاؤں کے قریب فروری 1846ء میں لڑی گئی۔ اس جنگ کی کہانی بہت ہی دلچسپ ہے۔ سکھ خالصہ افواج نے مارو یا مر جاؤ کے جذبے سے یہ جنگ لڑی۔

رنجیت سنگھ کی موت 1839ء میں ہوئی ہے۔ اس کی موت کے بعد کوئی بھی ایسا شخص نہ تھا جو اس کی جگہ لے سکتا۔ اس کے بیٹے دلیپ سنگھ کی عمر وقت پانچ سال تھی ،کچھ لوگوں نے سات سال بھی لکھی ہے۔ دلیپ سنگھ ایک بچہ تھا۔ ان حالات میں رنجیت سنگھ کی بیوی رانی جنداں نے ایک طرح سے تخت سنبھالا۔ رانی جنداں کی حکمرانی 1843ء سے زز 1846ء تک قائم رہی اور اس دوران سکھ فوج نے بھی اپنی من مانی شروع کردی۔

The Battle of Sobraon. Photo Credit: https://en.wikipedia.org/wiki/Battle_of_Sobraon

انگریزوں اور سکھوں کے درمیان 1845ء میں فیروزپور کے علاقے میں پہلی جنگ ہوئی ہے اور وہ جنگ سکھ ہار گئے۔ دوسری جنگ فروری 1846ء میں ہوئی جبکہ تیسری جنگ 1849ء میں کھاریاں میں ہوئی اور اسکے بعد انگریزوں کا ہندوستان پر مکمل قبضہ ہو گیا۔

یاد رہے کہ یہ جنگیں انگریزوں اور سکھوں کے درمیان تھیں۔ انگریزوں کے مقابلے میں کوئی بھی مسلمان سردار نہیں تھا بلکہ بے شمار مسلمان راجاؤں اور نوابین کے علاوہ مذہبی راہ نماؤں نے بھی انگریزوں کا ہی ساتھ دیا۔ یہاں میں صرف سوبراؤں کی جنگ کا ذکر کرنا چاہوں گا۔ سکھوں کی تاریخ میں سوبراؤں کی جنگ کا تفصیل سے ذکر ملتا ہے۔ اسی جنگ میں ستلج پر بنے ہوئے پل ٹوٹنے جیسے کئی واقعات کا بھی ذکر سامنے آتا ہے۔ جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ واقعہ چند غدار سکھوں کی وجہ سے پیش آیا۔ اس پل کے ٹوٹنے کی وجہ سے بیس ہزار سے زائد سکھ گھیرے میں آ گئے، جو شکست کی اصل وجہ بنی۔ اس جنگ کے نتیجے میں دس ہزار سے زائد سکھ مارے گئے۔ اس کے بعد سکھوں کی تمام تر طاقت ختم ہو چکی تھی اور وہ اب انگریزوں کے رحم و کرم پر تھے۔

اس موقع پر سکھ دربار، جس کی سربراہی رانی جنداں کر رہی تھی نے گلاب سنگھ کو جو کہ کشمیر اور جموں میں سکھ دربار کی طرف سے گورنر یا صوبیدار تھا کو بلوایا تاکہ وہ انگریزوں سے مذاکرات کرے۔ اس نے مذاکرات کیے۔ جس کے نتیجے میں ایک عظیم سانحہ رونما ہوا۔ جو اس سے پہلے اور بعد میں کہیں پر بھی نہ ہوا۔ یہی وہ بات تھی میں جس کی تلاش میں تھا کہ کشمیر کا سودا کیوں کر ہوا؟

ان مذاکرات کے نتیجے میں 9 مارچ 1846ء کو معاہدہ لاہور لکھا گیا۔ جس کے مطابق سکھ ریاست کا خاتمہ ہو گیا اور رانی جنداں کی بجائے ریاست کا تمام اختیار ایسٹ انڈیا کمپنی کے پاس چلا گیا۔ دلیپ سنگھ کی ذمہ داری انگریزوں نے لے لی اور اسے انگلینڈ بجھوا

دیا۔ رانی جنداں کو بھی لاہور چھوڑنا پڑا، دونوں الگ الگ رہے۔ طویل مدت بعد انگریزوں نے دلیپ سنگھ کو اپنی ماں سے ملنے کی اجازت دی۔ یہ ایک دلچسپ داستان ہے۔ جس کا تفصیلی ذکر یہاں مناسب نہیں ہے۔

لاہور جو گیارویں صدی سے غزنوی کے دور سے مسلمانوں کا ایک اہم مرکز رہا ہے اور کئی بادشاہوں نے اسے پایہ تخت بھی بنائے رکھا وہ صرف چند سال سکھوں کے قبضے میں رہا اور اب اس داتا کی نگری پر انگریز قابض تھے۔

اس معاہدے کے تحت اس وقت کے گورنر جنرل ہنری ہارڈنگز کی سربراہی میں ایک کونسل بنائی گئی جو براہِ راست اس سکھ ریاست کی وارث بن گئی۔ اس وقت وہ ریاست ایک طرف کشمیر، گلگت اور سکردو تک جبکہ دوسری طرف پشاور، کوہاٹ، بنوں اور ملتان تک کے علاقوں پر مشتمل تھی۔ انگریزوں نے ان سب علاقوں کو برٹش انڈیا کا حصہ بنایا اور لیکن کشمیر کے ساتھ ایک الگ برتاؤ کیا گیا۔

اس جنگ میں فتح حاصل کرنے کے بعد انگریزوں نے سکھوں سے بطور تاوان ایک کڑور پچاس لاکھ روپیہ طلب کیا۔ سکھ دربار کے پاس اتنی بڑی رقم نہیں تھی۔ رانی جنداں نے کچھ رقم کا تو بندوبست کرلیا لیکن انگریزوں کا مطالبہ پورا نہیں ہوا۔ اس موقع پر گلاب سنگھ نے کہا کہ اگر کشمیر اور اس سے ملحقہ علاقے اسے دے دیے جائیں تو اس کے بدلے وہ 75 لاکھ روپیہ ،اس دور میں شاید اسے نانک شاہی سکہ کہتے تھے ،دینے کو تیار ہے۔

انگریزوں نے اس کی یہ بات مان لی اور پھر 16 مارچ 1846ء کو امرتسر کا معاہدہ ہوا جس میں ایک طرف گلاب سنگھ اور دوسری طرف انگریز تھے۔ اس معاہدے کی رو سے ریاست جموں و کشمیر کا نیا حکمران راجہ گلاب سنگھ بن گیا اور یوں ایک مسلمان ریاست جس پر پہلے رنجیت سنگھ نے قبضہ کیا، جس میں سردار شام سنگھ بھی شامل تھا اور

اسکی موت کے بعد ایک ہندو راجہ اس کا سربراہ بنا۔ پھر تقسیم ہند ہوئی۔ قانون کے مطابق اس ریاست کو حق خود ارادیت نہ دیا گیا اور اب اس پر دہلی حکومت کر رہا ہے۔

The Lahore Treaty Photo Credit: https://nitter.net

رنجیت سنگھ کی موت کے بعد دربار کی حیثیت ختم ہو چکی تھی اور اس کے پاس دینے کو کچھ نہیں تھا لیکن گلاب سنگھ کے لیے ایک موقع تھا کہ وہ دربار کی طرف سے رقم کی ادائیگی کرتا جس کے بدلے میں سے جموں و کشمیر کی حکمرانی مل سکتی تھی۔ لہٰذا اس نے ایسا ہی کیا۔ اس سے یہ بات بھی ظاہر ہوتی ہے کہ انگریزوں نے کشمیر فتح نہیں کیا تھا بلکہ سکھ ریاست کے خاتمے کے بعد کشمیر، جو کہ سکھ ریاست کا ایک مقبوضہ علاقہ تھا کو اس علاقے کے جرنیل یا نمائندہ گلاب سنگھ ڈوگرہ سے ایک خطیر رقم بطور تاوان جنگ لے کر اس کے حوالے کر دیا تھا۔

اس معاہدے کے بعد ڈوگرہ راج شروع ہوا۔۔ جو تقسیم ہند تک جاری رہا۔۔۔ اس کے بعد کشمیری مسلمانوں کی غلامی کا نیا دور شروع ہوا۔۔۔ یہ کب ختم ہو گا۔۔۔ معلوم نہیں لیکن امید ضرور ہے۔

یہ تھی اصل کہانی کہ کس طرح انگریز نے باقی سارا پنجاب تو برٹش انڈیا کا حصہ بنایا لیکن وادی کشمیر اور جموں کو ایک ہندو ڈوگرہ راجہ کو فروخت کر دیا۔۔۔

Amritsar Treaty
Photo Credit: https://www.spreaker.com

جہاں قصور خریدنے والے کا ہے وہیں سب سے بڑا قصور وار وہ ہے جس نے اسے بیچا۔۔۔اور وہ بھی جنھوں نے اسے پنجاب فتح کرنے میں مدد دی۔۔۔وہ کون ہیں، یہ سب جانتے ہیں۔ان کی اولاد آج بھی ہماری حکمران ہے۔

جب ہم اٹاری سے گزرے تو مجھے یاد آیا کہ میں نے ایک کتاب میں پڑھا تھا کہ جب سردار شام سنگھ اس جنگ میں شریک ہونے کے لیے گھر سے چلا گیا اور ابھی جنگ ختم بھی نہیں ہوئی تھی اور نہ ہی سردار شام سنگھ کی موت کی خبر آئی تھی کہ اس کی بیوی مائی سادہ نے شادی کا لباس پہنا اور ستی کی رسم ،خاوند کی موت کے بعد بیوی کا زندہ جل جانا، ادا کی۔ سب نے اسے کہا کہ ابھی تو سردار شام سنگھ کی موت کی خبر بھی نہیں آئی تو آپ ایسا کیوں کر رہی ہیں؟اس نے جواب دیا کہ مجھے معلوم ہے کہ اب ہمیں شکست ہو رہی ہے۔ایسی صورت میں سردار شام سنگھ نا تو میدان جنگ سے بھاگے گا اور نا ہی قیدی بنے گا۔ وہ میدن جنگ میں قتل ہونا پسند کرے گا۔ اس لیے مجھے یقین ہے کہ وہ قتل ہو جائے گا اس لیے میں ستی کر رہی ہوں۔

مجھے اس موقع پر انسانی جذبات کے مختلف احساسات ، اس میں محبت کے ساتھ ساتھ اس بات کا بھی اندازہ ہوتا کہ کوئی شخص کسی صورت حال میں کیا کرے گا، بھی جاننے کا موقع ملا!

یہ محبت اور اعتماد کی ایک خوبصورت کہانی ہے!

اٹاری کی وجہ شہرت چتر سنگھ اٹاری والا، اس کے دو بیٹے شیر سنگھ اٹاری والا اور اواتار سنگھ اٹاری والا بھی ہیں۔ یہ وہی شیر سنگھ ہے جس نے چیلیانوالا کھاریاں، کی جنگ میں سکھوں کی سربراہی کی تھی۔ چیلیانوالا کے بارے میں اکثر لوگوں کا کہنا ہے کہ جنگ کے دوران بارش کی وجہ سے کوئی فیصلہ نہ ہو سکا تھا۔ میرے علم کے مطابق وہ سکھوں اور انگریزوں کے درمیان تیسری لڑائی تھی۔ پہلی 1945ء میں فیروز پور کے پاس، دوسری 1946ء میں سوبراؤں گاؤں کے پاس اور تیسری 1949ء میں چیلیانوالا میں لڑی گئی۔ کچھ کتابوں میں یہ بھی لکھا ہے کہ اس کے بعد گجرات میں بھی ایک جنگ ہوئی تھی لیکن شاید وہ چھوٹے پیمانے پر تھی۔

1839ء سے 1849ء تک سکھوں اور انگریزوں کے درمیان مسلسل جنگیں ہوتی رہیں۔ دس سال تک خالصہ فوج نے انگریزوں کا خوب مقابلہ کیا۔ جو کہ ایک طویل عرصہ ہے۔ خاص طور پر اس وقت جب انگریز اپنی فوجی طاقت میں بے حد اضافہ کر چکے تھے۔ وہ اس سے پہلے مراٹھوں کو بھی شکست دے چکے تھے۔

At Chillian Wala last war between Sikh and Britshers
with Dear Saad Murtiza

Monument at Chillian Wala

اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ رنجیت سنگھ کی وفات کے بعد مسلمان الگ تھلگ ہو گئے تھے بلکہ اکثر مسلمان نوابوں، راجاؤں اور مذہبی راہ نماؤں نے انگریزوں کا ساتھ بھی دیا تھا۔ ایسا کیوں ہوا، اسکی بھی کئی وجوہات ہیں۔ جس کے بارے میں میں کچھ لکھنا بھی چاہتا ہوں۔ انشاء اللہ۔

یہ تھی اٹاری سے وابستہ لوگوں کی ایک تاریخ جو مجھے اٹاری سے گزرتے ہوئے یاد آئی۔

دہلی اٹاری سے چار سو کلومیٹر سے بھی کم فاصلے پر واقع ہے لیکن اس کے راستے میں کئی اہم شہر آتے ہیں۔ جن میں سے کچھ کا ذکر تو میں نے اپنے پچھلے سفر نامے میں بھی کیا ہے اور باقی کا ذکر انشاء اللہ العزیز آئندہ صفحات میں کروں گا۔ ان اہم شہروں میں امر تسر، جالندھر اور لدھیانہ حامل ہیں۔

اجنالہ: جہاں سینکڑوں کی تعداد آزادی کے متوالوں کے زندہ دفن کیا گیا

اردو ادب سے دلچسپی رکھنے والے لوگوں کو قمر اجنالوی کے نام سے تو ضرور شناسائی ہو گی۔ قمر اجنالوی کی پیدائش بھارت کے شہر اجنالہ میں ہوئی۔ جب ہم اٹاری سے نکلے تو میں نے نقشے پر دیکھا کہ ہمارے بائیں طرف، یعنی اٹاری کے شمال میں بیس پچیس کلومیٹر کے فاصلے پر اجنالہ شہر آباد ہے۔ اجنالہ کا نام پڑھ کر مجھے قمر اجنالوی یاد آئے۔ یہ 1980ء کی دہائی کے ایک بے حد مقبول شاعر تھے۔ آپ نے دو درجن سے زائد کتابیں لکھیں۔ ان کی کتابوں کے عنوانات سے ہی پتہ چلتا ہے کہ وہ بائیں بازو سے تعلق رکھتے تھے لیکن جب میں نے اجنالہ کے بارے میں پڑھا تو مجھے ایک بہت ہی حیران کن واقعے کا پتہ چلا۔

تاریخ سے معلوم، ہوتا ہے کہ تحریک آزادی ہند کے دوران 26ویں انفنٹری کے کئی سو سپاہیوں نے میاں میر چھاؤنی لاہور، میں بغاوت کر دی۔ جب تحریک ناکام ہو گئی تو آزادی کے متوالے ان تمام سپاہیوں کی قسمت کا فیصلہ انگریزوں کے ہاتھ میں تھا۔ کسی نے ان فوجیوں کو یقین دلوایا کہ ان پر منصفانہ مقدمہ چلایا جائے گا، معافی بھی مل سکتی ہے لیکن ان لوگوں کے ساتھ انگریزوں نے وہ سلوک کیا جسے کسی بھی طور پر جائز نہیں کہا جا سکتا۔

ہوا کچھ یوں کہ جب تقریباً پانچ سو سپاہی امر تسر ضلع کے اجنالہ قصبے تک پہنچنے کے لیے دریائے راوی کے پار پہنچ گئے تو دو سو سے زائد کو انگریزوں نے قتل کر دیا۔ باقی

تین سو کے قریب فوجیوں نے اجنالہ میں پناہ حاصل کرنے کی کوشش کی۔ وہ سب لوگ ایک چھوٹے سے کمرے میں جمع ہو گئے۔ جہاں بہت سے لوگ تو دم گھٹنے کی وجہ سے ہی دم توڑ گئے۔ باقی جو زندہ بچے انھیں انگریزوں نے گولیاں مار کر ہلاک کر دیا اور ان کی لاشیں ایک کنویں میں پھینک دیں۔ اس کنویں کو "شہیداں دا کھو" کا نام دیا گیا۔

Shaheedi Khoh where Indian soldiers bodies were thrown in 1857 At Ajnala Photo Credit: https://en.wikipedia.org/wiki/Shaheedan_da_Khu

تقریباً اڑھائی سو سال بعد فروری 2014ء میں اس کنویں کی کھدائی کی گئی اور بائیس فوجیوں کی باقیات کو کنویں سے نکالا گیا۔ بعد میں ایک مرتبہ پھر کھدائی کی گئی تو چالیس مزید لاشیں برآمد ہوئیں۔ اس واقعے کی تمام تر ذمہ داری Frederick Henry Cooper کے سر ہے جو اس وقت اس علاقے میں انگریزوں کی طرف سے ڈپٹی کمشنر تعینات تھا۔

یاد رہے ہم نے لاہور میں اس "ظالم" شخص کی یاد میں ایک سڑک کا نام بھی کوپر روڈ رکھا ہوا ہے جو بیڈن روڈ سے پنجاب اسمبلی کی طرف جاتی ہے۔

بھارت نے اجنالہ میں ان شہیدوں کی یاد میں ایک یادگار بھی تعمیر کی ہے جبکہ ہم نے لاہور کی ایک اہم ترین سڑک، جس پر ہمارے حکمران سفر کرتے ہیں، کا نام اس

شخص کے نام پر رکھا ہوا ہے جس نے آزادی کے پانچ سو سے زائد متوالوں کی ظالمانہ طریقے سے قتل کیا۔

کوپر نے جنگ آزادی کے واقعات پر ایک کتاب بھی لکھی ہے۔ جس میں اس طرح کے کئی قصوں کا ذکر پایا جاتا ہے۔ وہ کتاب میں نے انٹرنیٹ سے حاصل کی ہے۔

اس کتاب کا نام: The crisis in the Punjab : from the 10th of May until the fall of Delhi by Cooper, Frederick, 1826 or 7-1869 اگر آپ بھی یہ سب پڑھنا چاہتے ہیں تو درج ذیل لنک سے یہ کتاب حاصل کر سکتے ہیں۔ https://archive.org/ details/crisisinpunjabfr00coop/ page/10/mode/2up اس کتاب کے جس صفحہ پر یہ سب کچھ لکھا ہوا ہے میں اس کی تصویر یہاں دے رہا ہوں۔

ushered into a large round tower or bastion.

Previously to his departure with the pursuing party from Umritsur, the Deputy Commissioner had ordered out a large supply of rope, in case the numbers captured were few enough for hanging (trees being scarce), and also a reserve of fifty Sikh Levies for a firing party, in case of the numbers demanding wholesale execution; as also to be of use as a reserve in case of a fight on the island. So eager were the Sikhs that they marched straight on end, and he met them half way, twenty-three miles between the river and the police station, on his journey back in charge of the prisoners, the total number of which, when the execution commenced, amounted to 282 of all ranks, besides numbers of camp-followers, who were left to be taken care of by the villagers.

As fortune would have it, again favouring audacity, a deep dry well was discovered within one hundred yards of the police station, and its presence furnished a convenient solution as to the one remaining difficulty which was of sanitary consideration—the disposal of the corpses of the dishonoured soldiers.

ترن تاران: پانچ سو سالہ ایک قدیم شہر

ہم اٹاری سے آگے نکل کر امر تسر کی طرف رواں دواں تھے۔ ہمارے ارد گرد گندم کی کٹائی کے بعد چاول کی فصل کے لیے زمین تیار ہو رہی تھی۔ مقامی ضلع کی پولیس کی گاڑی ہماری بس کے آگے چل رہی تھی۔ مجھے ارد گرد کے ماحول میں کوئی فرق محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ ہم لاہور سے چند کلومیٹر ہی دور تھے۔ مجھے اس سفر میں سب سے زیادہ امر تسر گولڈن ٹیمپل دیکھنے کی خواہش تھی۔ بس میں ہمارے ساتھ سوار گائیڈ سے میں نے پوچھا کہ کیا ہم گولڈن ٹیمپل دیکھ سکیں گے؟ جس پر اس نے بتایا کہ ہم دور سے اسے ضرور دیکھ سکیں گے۔ یہ جان کر مجھے بے حد خوشی ہوئی۔ مجھے اس لمحے کا بے قراری سے انتظار تھا لیکن اس سے پہلے کہ میں امر تسر کا ذکر کروں میں چاہوں گا کہ ہمارے دائیں طرف چند کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ایک اہم شہر کا ذکر بھی ضرور کیا جائے۔

ترن تاران، جو امر تسر سے پچیس کلومیٹر کے فاصلے پر جنوب مغرب میں واقع ایک نہایت ہی اہم شہر ہے۔ اس شہر کی بنیاد پانچویں سکھ گرو، شری گروار جن دیو جی نے سولہویں صدی میں رکھی تھی اور اس نام کی وجہ اس علاقے کی خوبصورتی ہے۔ یہ علاقہ مدت تک بھنگی مثل کا ایک اہم حصہ بھی رہا۔

یہ بات میرے لیے خاصی نئی تھی کہ تقسیم ہند کے وقت وسطی پنجاب کے چند اضلاع ایسے بھی تھے جہاں سکھوں کی اکثریت تھی۔ ان میں ترن تاران کے ساتھ ساتھ شیخوپورہ، لدھیانہ ، جالندھر ، ہشیارپور، کپورتھلہ ، امر تسر ، لائل پور ، اور پٹیالہ شامل تھے۔ ایک مرتبہ جب تقسیم ہند کے وقت سکھوں کے لیے ایک الگ ملک کی بات ہوئی تو اس وقت ان اضلاع میں ترن تاران بھی شامل تھا۔

ترن تاران کی اہم بات یہاں کا گوروارجن دیو جی گردوارہ ہے۔اس گردوارے کی تعمیر سولہویں صدی میں شروع ہوئی۔رنجیت سنگھ کے دور میں بہت سا کام ہوا اور بعد میں اس کے پوتے نہال سنگھ نے اس میں اضافہ کیا۔ تاریخ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ پہلی مرتبہ کسی بھی گردوار کی دیوار پر سونے کی تہہ یہیں پر چڑھائی گئ تھی۔

اس کے علاوہ یہاں پر کئی اور گردوارے بھی بنائے گئے اور شہر کی چار دیواری بھی کی گئی۔ یہاں پر بنگا نام کا ایک گردوارہ بھی موجود تھا۔ اسی وجہ سے شاید ایک بھنگی مثل بھی بنی تھی۔ سکھوں کے مختلف گروہ تھے ان کو عام طور پر مثل کہا جاتا تھا۔ لاہور کے مال روڈ پر موجود بھنگیوں کی توپ کا تعلق اسی مثل سے ہے۔اس مثل کا اصل گڑھ یہی شہر تھا۔ انگریزوں کے دور میں جب سکھوں کا راج ختم ہوگیا تو گردوارہ صاحب کی ذمہ داری انگریزوں نے لے لی۔ جس پر سکھوں نے کافی شور مچایا لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا۔

یہ سب جان کر مجھے اس بات کا اندازہ ہوا کہ جب انگریزوں نے پنجاب کو فتح کرلیا ہوگا اور ان کے سامنے کوئی مزاحمت کرنے والا بھی نہیں تھا تو انھوں نے ہر طرح کی زیادتی کی ہوگی۔ اس کے بعد سکھوں نے گردواروں کی بہتری کے لیے ایک تحریک بھی چلائی لیکن وہ بھی کامیاب نہ ہوئی اور سکھوں کی بجائے اس علاقے میں عیسائی پادریوں کا راج ہونے لگا۔

یہ بات بھی ہے دلچسپ اب تک میں نے بھارت کے جتنے بھی شہروں کا ذکر کیا ان میں کہیں نا کہیں ایک دو فیصد مسلمان تو ضرور بستے ہیں کہ لیکن ترن تاران ایک ایسا ضلع ہے جہاں مسلمانوں کی تعداد اعشاریہ تین فیصد ہے، جو کہ نا ہونے کے برابر ہے۔

یاد رہے یہ شہر سکھوں کی تہذیب و تمدن کا سب سے اہم شہر ہے۔ یہاں دربار صاحب ارجن دیو جی کے ساتھ ساتھ کئی اور گردوارے بھی موجود ہیں۔ یہاں پر موجود ایک بہت بڑے تالاب کا ذکر کرنا بھی بہت ضروری ہے جس کی لمبائی ساڑھے نو سو فٹ اور چوڑائی ساڑھے سات فٹ ہے۔ یہ گردواروں میں موجود ایک بہت بڑا تالاب ہے۔

ہم اس شہر کو نہ دیکھ سکے کیونکہ وہ ہمارے راستے سے کافی دور تھا، لیکن جس سکھ سے میں نے اس کے متعلق بات کی اس نے ہمیں یہ ضرور بتایا کہ ان کے نزدیک جتنا امرتسر میں واقع گولڈن ٹیمپل اہم ہے اتنا ہی گردوارہ گوروارجن دیو بھی اہم ہے۔ یہ بھی یاد رہے کہ خالصتان تحریک کے دوران یہ علاقہ سکھوں کا بہت اہم گڑھ تھا۔ ترن تاران سے گوروارجن دیو جی کا گہرا تعلق ہے۔ اس لیے مناسب ہو گا کہ میں ان کے بارے میں چند معلومات آپ کی خدمت میں پیش کروں۔

سکھوں کے نزدیک گوروارجندیو جی سکھ مذہب میں شہید ہونے والے دو گوروؤں میں سے پہلے ہیں۔ شہید کا لفظ ہم عام طور پر مسلمانوں کے لیے بولتے ہیں لیکن سکھ بھی یہ لفظ ان لوگوں کے لیے بولتے ہیں جو کسی اعلیٰ مقصد کے لیے قتل کیے گئے ہوں اس وجہ سے میں بھی شہید کا لفظ لکھ رہا ہوں۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ پانچویں سکھ گرو بھی ہیں۔ یاد رہے سکھ دھرم میں کل دس گورو ہیں۔

گوروارجن دیو جی نے پہلی مرتبہ سکھوں کی مذہبی کتاب ترتیب دی جسے ادی گرنتھ صاحب کہا جاتا تھا۔ بعد ازاں اسے ہی گرنتھ صاحب کہا جانے لگا۔ اس طرح انھیں سکھ دھرم میں ایک خاص مقام حاصل ہے۔

انھوں نے سکھ دھرم میں مسند کا نظام بھی شروع کیا۔ جس کے تحت سکھوں سے یہ کہا گیا کہ اگر ممکن ہو تو وہ اپنی آمدنی کا دسواں حصہ ،سامان یا روپیہ، مسند کے لیے دیں۔ مسند کی یہ ذمہ داری تھی کہ وہ نا صرف فنڈز جمع کرے بلکہ سکھ مذہب کی تعلیمات بھی سکھوں کو سکھائیں اور اس کے علاوہ ان کے

باہمی تنازعات بھی حل کرنے کی کوشش کرے۔ اس کے ساتھ ساتھ لنگر کا بھی انتظام کرے۔

The Sarovar besides the GurudwaraTarn Taran Sahib, Punjab, India. Photo Credit: https://en.wikipedia.org/wiki/Tarn_Taran_Sahib

تاریخ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ گوروارجن دیو جی کو مغل بادشاہ جہانگیر کے حکم پر گرفتار کیا گیا اور اسے اسلام قبول کرنے کے لیے کہا جس پر گورو نے انکار کر دیا۔ جس پر 1606ء میں انھیں تشدد کا نشانہ بنا کر پھانسی دے دی گئی۔ اب بھی ہر سال گوروارجن کی یاد میں ایک دن منایا جاتا ہے۔ تاریخ دانوں کا یہ کہنا ہے کہ مغلوں اور سکھوں کے تمام تر اختلافات کی بنیاد سیاسی تھی۔ مغل انھیں اپنے لیے خطرہ سمجھتے تھے اس لیے انھوں نے سکھوں کا قتل عام بھی کیا اور ان کے کئی گورو بھی قتل کیے لیکن کچھ تاریخ دانوں نے اسے مذہبی رنگ بھی دیا ہے۔

میں نے اس موضوع پر ایک پی ایچ ڈی کا مقالہ پڑھا جو ایک مسلمان نے لکھا تھا۔ اس کے مطابق اگر کسی مسلمان نے کسی کو زبردستی اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا تو وہ اسلام کی بنیادی تعلیمات کے خلاف ہوگا۔ اسلام میں اس بات کی اجازت نہیں ہے۔ ان کے نزدیک اس طرح کے معاملات کا تعلق اپنی ریاست بچانے سے ہے۔ ایسا کرنے والا ایک مسلمان تھا اس لیے اسے اسلام سے جوڑا گیا۔ انھوں نے یہ بھی لکھا کہ ان مسلمان

بادشاہوں نے اس طرح کا ظلم صرف غیر مسلمانوں سے ہی نہیں بلکہ ایسا اپنے ہم مذہب لوگوں کے ساتھ بھی کیا ہے۔

www.BaruSahib.org
The rays of light merge with the sun, and water merges with water.
One's light blends with the Light, and one becomes totally perfect.
Jyoti Jyot Purab
Guru Angad Dev Ji

Photo Credit: https://www.facebook.com

ظلم کسی بھی وجہ سے کیا گیا ہو۔۔۔ ظلم پھر ظلم ہی ہے۔۔۔ ہر حال میں قابلِ مذمت ہے۔

امر تسر (امبر سر)، گولڈن ٹیمپل، جلیانوالہ باغ، بلیو سٹار آپریشن

تقریباً دس بجے ہم امر تسر کے قریب پہنچ چکے تھے۔ امر تسر کئی لحاظ سے ایک اہم اور تاریخی شہر ہے۔ میری اس سے دلچسپی کی کئی وجوہات ہیں۔ ان میں سے ایک وجہ تو اس شہر کا تاریخ میں اہم مقام ہونا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ دوسری اہم وجہ لاہور میں رہتے ہوئے ایسے لوگوں کا ملنا تھا جو امر تسر سے ہجرت کرکے لاہور آئے تھے اور وہ ہمیشہ شوق سے امر تسر کی باتیں کرتے تھے۔ ان دو باتوں نے میری اس شہر میں دلچسپی کو مزید بڑھا دیا۔ یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ لاہور کے لوگ اس شہر کو امر تسر کی بجائے امبر سر کہتے ہیں۔

امر تسر لاہور سے پچاس کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ صدیوں سے ان دونوں شہروں کے درمیان کبھی کوئی سرحد نہیں رہی۔ دونوں طرف پنجابی ہی آباد تھے اور اسلام

کی آمد سے قبل مذہب بھی ایک ہی تھا۔ ان کا رہن سہن بھی بہت حد تک ایک جیسا ہی تھا۔ میں امر تسر کی تاریخ پڑھنے کے بعد یہ کہہ سکتا ہوں کہ لاہور اور امر تسر ایک طرح سے جڑواں شہر ہی ہیں۔

تقسیم ہند سے پہلے ان دونوں شہروں کے درمیان بسنے والے لوگوں کی آپس میں رشتے داریاں بھی تھیں، دونوں شہروں میں کثیر تعداد میں مسلمان اور ہندو کشمیری آباد تھے۔ دونوں شہر جی ٹی روڈ پر واقع ہونے کی وجہ تجارتی لحاظ سے بھی اہم مانے جاتے تھے۔ اس کے علاوہ یہ شہر ہمیشہ سے ایک ہی حکمران کے زیر تحت رہے ہیں، چاہے وہ مسلمان ہو غیر مسلم۔ اس لیے امر تسر کو دیکھ کر مجھے کوئی خاص فرق محسوس نہیں ہو رہا تھا بلکہ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے میں لاہور کے ہی علاقے دیکھ رہا ہوں۔

امر تسر: صدیوں قبل کا ایک مذہبی شہر

تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ امر تسر ماجھا کے علاقے میں واقع ایک قدیم مذہبی اور بھارتی پنجاب کا دوسرا بڑا شہر ہے۔ اس کی آبادی پندرہ لاکھ کے قریب ہے۔ چندی گڑھ سے اس کا فاصلہ 220 کلومیٹر ہے۔

میں نے پچھلے صفحات میں اس بات کا ذکر کیا ہے کہ ہندو دھرم کی شروعات ہندوستان کے شمالی علاقہ جات سے ہوئی تھی۔ جس میں کورو کیشتر سرِ فہرست ہے۔ تاریخ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ہندوؤں کا ایک گورو جس نے رامائن لکھی ہے بھی اسی علاقے کا رہنے والا تھا۔ ہندوؤں کی کتابوں میں یہ بھی لکھا ہے کہ سیتا کے دو بیٹے، ایک کا نام لاوا اور دوسرے کا نام خوشا تھے۔ لاوا نے لاہور آباد کیا جبکہ خوشا نے قصور کی بنیاد رکھی۔ یہ سب قدیم تاریخی واقعات ہیں اور ان میں کتنی صداقت ہے، حتمی بات کہنا مشکل ہے لیکن ہندو تاریخ میں کچھ ایسا ہی لکھا ہوا۔

ماضی قریب کو دیکھتے ہوئے یہ جاننے کا موقع ملتا ہے کہ سکھوں کے گورو رام داس نے امر تسر شہر کی بنیاد رکھی تھی۔ انھوں نے اس شہر کو آباد کرنے کے لیے گاؤں والوں سے زمین خرید کر اس کی بنیاد رکھی۔ تاریخ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اگر وہ چاہتے تو وہ یہ زمین مفت بھی لے سکتے تھے لیکن انھوں نے ایسا کرنا مناسب نہیں سمجھا۔

کچھ لوگ اس بات کے قائل ہیں کہ شہنشاہ اکبر نے یہ زمین گورورام داس کی اہلیہ کو عطیہ کر دی تھی۔ سب ہی حقیقت کی کھوج میں ہیں۔۔۔ سچ کیا ہے۔ شاید کسی کو بھی معلوم نہیں۔

شروع میں اس گاؤں کا نام گوروکا چک تھا۔ بعد ازاں کسی وجہ سے ایک نیا شہر بسایا گیا اور اس کا نام رام داس پور رکھا گیا۔ گورورام داس نے اس شہر کو ایک تجارتی شہر بنا دیا اس شہر کے درمیان میں ایک بڑا تالاب بھی بنایا گیا۔ اسی جگہ پر گردوارہ ہر مندر صاحب بھی بنایا گیا جسے عام طور پر گولڈن ٹیمپل بھی کہا جاتا ہے۔ جب احمد شاہ ابدالی نے ہندوستان پر حملے کیے تو ان حملوں میں گولڈن ٹیمپل کو بھی تباہ کیا گیا اور بے شمار لوگوں کا قتل عام بھی ہوا۔ رنجیت سنگھ نے بھی اس گوردوارے کی بے حد خدمت کی۔

Golden Temple Photo Credit: https://en.m.wikipedia.org

میں نے اکثر لوگوں سے یہ بھی سنا ہے کہ گورو نانک نے گولڈن ٹیمپل کی بنیاد لاہور کے ایک صوفی بزرگ میاں میر سے رکھوائی تھی۔ اسی وجہ سے کئی سکھ بھی ان کے دربار پر آتے ہیں۔ میں نے جب اس سے متعلق مزید جانا تو پتہ چلا کہ 1581ء میں، گورو جن نے گوردوارے کی تعمیر کا آغاز کیا اور شروع میں تالاب کو خشک رکھا گیا۔ گورو ارجن صاحب نے گردوارے کا منصوبہ سطح زمین کے نیچے بنایا۔ اس کی وجہ یہ بتائی گئی کہ جو لوگ یہاں آئیں وہ احاطے میں داخل ہونے سے پہلے اپنی انا کا بت توڑ کر عاجزی اختیار کریں۔

انھوں نے یہ حکم بھی دیا کہ گردوارے کے احاطے کو ہر طرف سے کھلا رکھا جائے۔ یہ اس لیے کیا گیا تاکہ سب کو پتہ چلے کہ یہ گردوارہ ہر کسی کے لیے کھلا ہے اور کوئی بھی کسی بھی طرف سے آسکتا ہے۔ تاریخ کی مختلف کتابوں سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اسی دور میں میاں میر صاحب کو گردوارے کا سنگ بنیاد رکھنے کی دعوت دی گئی تھی۔ میاں میر کا دور 1550ء سے 1635ء تک کا ہے۔اس دور میں گورو ارجن نے سکھوں کی پہلی کتاب، جسے "ادی گرنتھ" بھی کہا جاتا تھا، کو گردوارے میں رکھا اور بابا بدھ کو پہلا گرنتھی مقرر کیا گیا۔

اب تک میں نے جو پڑھا ہے اسکے مطابق گولڈن ٹیمپل کی تعمیر اور اس میں قائم اکالی تخت نے سکھ مذہب کے فروغ کیلیے ایک اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس کے علاوہ یہ شہر تجارت اور دیگر سرگرمیوں کا بھی اہم مرکز بن گیا۔اس وقت امرتسر کی آبادی تقریبا پندرہ لاکھ ہے۔ ایک بات جو میرے لیے بھی کافی حیران تھی اور آپ بھی وہ جان کر حیران ہوں گے کہ امرتسر میں پچاس فیصد کے قریب ہندو رہتے ہیں جبکہ میرا یہ خیال تھا کہ امرتسر سکھوں کا مقدس مقام ہے اس لیے یہاں پر سکھوں کی اکثریت ہو گی لیکن ایسا نہیں ہے۔

لاہور کے قریب ہونے کے باوجود امرتسر میں اس وقت مسلمانوں کی تعداد نصف فیصد سے بھی کم ہے۔ جس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ تقسیم ہند کے وقت یا تو مسلمان قتل کر دیے گئے یا ان کو امرتسر چھوڑنے پر مجبور کر دیا گیا۔ یہ بالکل اسی طرح کی بات ہے جیسے تقسیم ہند سے پہلے لاہور شہر میں ہندو اور سکھ آبادی کے چالیس فیصد حصے سے بھی زیادہ تھے لیکن اب لاہور میں ان کا وجود نہ ہونے کے برابر ہے۔

یہ سب جان کر میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ان دونوں شہروں کے قریب ہونے کی وجہ سے اجاڑے کے وقت لوگوں نے ایک سے دوسرے شہر میں نقل مکانی کی۔ وہ نقل مکانی ان کی خواہش نہیں تھی بلکہ حالات ہی ایسے پیدا کر دیے گئے تھے کہ لوگوں کو اپنے ان علاقے کو چھوڑنا پڑا جہاں وہ صدیوں سے آباد تھے۔

کچھ سرحد پار کر گئے اور کچھ زندگی کی بازی ہار گئے!

جلیاں والا باغ بے گناہ لوگوں کا قتل عام اور قاتل کا قتل

امرتسر میں تاریخ کا ایک ایسا واقعہ بھی ہوا جب بے گناہ لوگوں پر اندھا دھند گولیاں چلائی گئیں۔ یہ لوگ 13اپریل 1919ء کو بیساکھی کے میلے میں شرکت کے لیے جلیانوالہ باغ میں اکٹھے ہوئے تھے۔ اس واقعے میں ایک ہزار سے زائد لوگ مارے گئے۔ میں اس واقعے کا ایک مختصر ذکر آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔

جنگ عظیم اول میں جب انگریز جنگ لڑ رہے تھے اس وقت موقع جان کر پنجاب میں لوگوں، خاص طور پر سکھوں اور ہندوؤں نے اپنی کارروائیاں تیز کر دیں۔ اسی دوران کئی تنظیمیں بھی بنائی گئیں جن میں ایک مشہور تنظیم غدر پارٹی بھی تھی۔ یہ وہی دور ہے جب مہاتما گاندھی افریقہ سے ہندوستان آ گئے تھے۔ کانگریس بھی انگریزوں کے خلاف بہت بڑی تحریک چلا رہی تھی۔ مسلم لیگ بھی آزادی کی جدو جہد میں شریک تھی۔

انگریز بھی اس تحریک کو روکنے کے لیے کوشش کر رہے تھے۔ انھوں نے کئی سیاسی رہنماؤں کو گرفتار بھی کیا۔ امر تسر میں بھی کئی لوگوں کو گرفتار کیا گیا۔ جس کے خلاف مقامی لوگوں نے بھر پور احتجاج بھی کیا اور اس میں بارہ سے زائد لوگ مارے گئے۔ اس واقعے کے تین روز بعد 13 اپریل 1919ء کو بیساکھی کے سلسلے میں ہزاروں سکھ، مسلمان اور ہندو جلیانوالہ باغ میں جمع ہوئے۔ یہ باغ گولڈن ٹیمپل کے پاس ہی واقع ہے۔ شام کے وقت کرنل ڈائر 65 گورکھا اور پچیس بلوچ سپاہیوں کو لیکر اس باغ میں پہنچا۔ اس نے مجمع کو منتشر ہونے کی دھمکی دیے بغیر باغ کے سارے دروازے بند کروائے اور اندھا دھند فائرنگ کا حکم دے دیا۔ انگریزوں کے بقول اس واقعے میں چار سو کے قریب لوگ مارے گئے جبکہ مقامی لوگوں کا کہنا تھا کہ مرنے والوں کی تعداد ایک ہزار سے بھی زائد تھی۔ اس اندوہناک واقعے کے بعد ایک اور واقعہ بھی رونما ہوا جو اسی سے جڑا ہوا ہے۔

ڈائر مری میں پیدا ہوا تھا اور اس کا باپ مری میں واقع مری بروری، شراب کی فیکٹری کا مالک تھا۔ اس نے اپنا بچپن مری اور شملہ میں گزارا تھا جبکہ ابتدائی تعلیم لارنس کالج گھوڑا گلی، مری میں حاصل کی تھی۔ بعد ازاں وہ برٹش فوج میں شامل ہو گیا۔ جلیانوالہ باغ کے واقعہ کی وجہ سے اسے امر تسر کا قصائی بھی کہا جاتا ہے۔ اس واقعے کے بعد اسے ڈیوٹی سے ہٹا دیا گیا۔ اس سب کے باوجود بھی اسے انگریزوں کے ہاں ایک اعلیٰ مقام حاصل ہے۔

اس دوران پنجاب کا گورنر سر مائیکل فرانسس او ڈائر تھا جبکہ جلیانوالہ میں فائرنگ کا حکم دینے والے کا نام کرنل ریگینالڈ ڈائیر تھا۔ بولنے میں دونوں کے نام ایک جیسے ہی تھے. ایک نے حکم دیا اور گورنر نے اس حکم کی توثیق کی،اس واقعے میں دونوں برابر کے شریک تھے۔

اودھم سنگھ 1899ء میں پنجاب کے ضلع سنگرور میں پیدا ہوا۔ ابھی وہ تین سال کا تھا کہ اس کی والدہ فوت ہو گئیں اور چند سال بعد والد بھی فوت ہو گئے۔ وہ اور اس کا بھائی امرتسر میں سکھوں کے قائم کردہ یتیم خانے میں رہنے لگے۔ جلیانوالہ باغ کے واقعے کے موقع پر اس کی عمر صرف 14 سال تھی اور وہ امرتسر میں ہی موجود تھا۔ بعد ازاں وہ غدر پارٹی میں شامل ہو گیا جو انگریزوں سے آزادی حاصل کرنے کی خاطر مسلح جدوجہد پر یقین رکھتی تھی۔ جب وہ جوان ہوا تو اس نے کرنل ڈائر کو قتل کرنے کا منصوبہ بنایا۔ کہتے ہیں کہ وہ اصل میں کرنل ڈائر کو قتل کرنا چاہتا تھا لیکن نام کی مماثلت کی وجہ سے اس نے جنرل اوڈائر کا قتل کر دیا۔

واقعہ کچھ یوں ہوا۔

ادھم سنگھ ہندوستان سے فرار ہو کر جرمنی چلا گیا اور 1934ء میں لندن آ گیا۔ 13 مارچ 1940ء کو جنرل مائیکل اوڈائر کو کیکسٹن ہال میں ایک تقریر کرنا تھی۔ ادھم سنگھ اپنی کتاب میں ایک پستول لے کر وہاں چلا گیا۔ دلچسپ بات یہ کہ اس نے وہ پستول کسی پب میں ایک انگریز فوجی سے خریدا تھا۔ اس تقریب میں ادھم سنگھ نے جنرل مائیکل اوڈائر کو گولی مار کر ہلاک کر دیا۔

Jalian wala Bagh massacre
Photo Credit: https://www.india.com

اسے گرفتار کر لیا گیا۔ تفتیش ہوئی۔ تفتیش کے دوران اس نے اپنا نام "رام محمد سنگھ آزاد" بتایا، جس میں تینوں مذاہب کے نام شامل تھے اور انگریزوں سے آزادی کا لفظ بھی اور کہا کہ میں نے یہ سب کچھ جلیانوالہ باغ کا بدلہ لینے کے لیے کیا ہے۔ یوں 27 سال بعد ایک سکھ نوجوان نے اپنے ہندوستانی بھائیوں کے قتل کا بدلہ لے لیا۔ جولائی 1940ء میں اسے عدالت کے حکم پر پھانسی کی سزا دے دی گئی۔

Photo Credit:
https://www.facebook.com/shaheedudhamsingh

بھارت بھر میں ادھم سنگھ کو شہید اعظم کہا جاتا ہے اور اتراکھنڈ میں ایک ضلع کا نام بھی اس کے نام پر رکھا گیا ہے۔

Jallian Wala Bagh Entrance Photo Credit:
https://en.wikipedia.org

آپریشن بلیو اسٹار بھارتی فوج کا گولڈن ٹیمپل پر قبضہ

جب ہم امر تسر سے گزر رہے تھے تو گولڈن ٹیمپل کو دیکھ کر مجھے یاد آیا کہ تقریباً بیس سال قبل جون 1984ء میں یہاں پر ایک بہت ہی اہم واقعہ پیش آیا تھا۔ ان دنوں سوشل میڈیا اتنا عام نہیں تھا لیکن اخبارات اور ٹی وی کے ذریعے بہت سی خبریں ملتی رہتی تھیں۔ اس دورے کے دوران مجھے ایک پڑھے لکھے سکھ سے ملنے کا بھی موقع ملا جن کی تاریخ پر گہری نظر تھی۔ ان سے میں نے اس واقعے سے متعلق بہت کچھ جانا جس کا ذکر آئندہ صفحات میں کیا جائے گا۔

Operation Blue Star: Photo Credit:
https://www.47roots.com/operation-blue-star/

فی الوقت میں آپ کو صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ 1984ء میں جب بھارت میں اندرا گاندھی کی حکومت تھی تو گولڈن ٹیمپل میں ایک بہت ہی اہم واقعہ پیش آیا جس میں سکھوں کے ایک راہ نما جرنیل سنگھ بھنڈراں والا اور ان کے بہت سے ساتھی مارے گئے۔ اس واقعے کا مختصر حال آپ کی خدمت میں پیش ہے۔ یاد رہے کہ سکھوں میں بھی کئی گروہ پائے جاتے ہیں اور ان میں سخت اختلافات بھی ہیں۔ 1978ء میں سکھوں کا

آپس میں ایک بڑا جھگڑا ہوا جس کے نتیجے میں جرنیل سنگھ بھنڈرانوالہ ایک مشہور سیاسی راہ نما کے طور پر سامنے آئے۔

ایک بڑے مجمعے میں یہ قرارداد پاس کی گئ جس میں ہندوستان سے سکھوں کے لیے ایک الگ ملک خالصتان کی مانگ کی گئ لیکن اس کے ساتھ ساتھ علیحدگی پسند سکھ یہ بھی کہتے رہے کہ ہم بھارت سے علیحدہ نہیں ہونا چاہتے۔ ہمارے تمام تر بیرونی معاملات، دفاع اور کرنسی وغیرہ بھارت کے پاس ہی رہیں گے۔ بھارتی حکومت نے اس مطالبے کو تسلیم نہیں کیا اور اسے ایک طرح کی بغاوت کا نام دے دیا۔

بہت سے سکھ آزاد خالصتان کے مؤقف کو لے کر چل پڑے اور یوں ایک سکھ تحریک شروع ہوئی۔ جرنیل سنگھ کا کہنا تھا کہ وہ منظور شدہ قرارداد کے مطابق اپنا حق لیں گے اور اگر بھارتی حکومت ان کے مطالبات نہیں مانتی تو وہ ان کے خلاف جنگ کریں گے۔ بہت سے لوگوں نے ان کا ساتھ دیا- اس طریقے سے ان کی تحریک نے جنم لیا اور پھر وہ گولڈن ٹیمپل میں واقع اکال تخت پر آکر بیٹھ گئے جسے ایک مقدس جگہ سمجھا جاتا ہے۔ بھارتی حکومت نے ان کے ساتھ مذاکرات کیے لیکن وہ کسی بھی نتیجے پر نہیں پہنچے۔ وقت کے ساتھ ساتھ گولڈن ٹیمپل میں جرنیل سنگھ کے حامیوں میں اضافہ ہوتا گیا- جب حکومت نے دیکھا کہ بات چیت سے یہ معاملہ حل ہوتا نظر نہیں آرہا تو وہ بذریعہ طاقت اس مسئلے کو حل کرنے پر غور کرنے لگے اور اسے آپریشن بلیو سٹار کا نام دیا۔

اس منصوبے کے تحت یکم جون 1984ء کو بھارتی فوج گولڈن ٹمپل میں داخل ہوئی ہے اور گولڈن ٹیمپل میں موجود جرنیل سنگھ اور ان کے ساتھیوں کا قتل عام کر دیا۔ 10 جون تک گولڈن ٹیمپل کا محاصرہ رہا ہے اور اس دوران بڑی تعداد میں جرنیل سنگھ اور ان کے ساتھیوں کو مار دیا گیا۔ کچھ زخمی ہوئے اور باقی لوگوں کو گرفتار کر لیا گیا۔

اس واقعے کے کچھ دن بعد اس وقت کے بھارتی صدر ذیل سنگھ نے گولڈن ٹیمپل کا دورہ کیا تو ایک نشانے باز نے انھیں کچھ فاصلے سے نشانہ بنایا۔ وہ تو بچ گئے لیکن ان کے ساتھ چلنے والے بھارتی فوج کے کرنل کو وہ گولی لگ گئی۔ اس واقعے کے نتیجے میں اندرا گاندھی کو بھی ان کے دو محافظوں نے قتل کر دیا تھا اور یوں پنجاب میں دیر تک بدامنی رہی۔

یہ ایک انتہائی تاریخی واقعہ ہے جس کی گونج آج تک سنائی دے رہی ہے۔ سکھ اس بارے میں بھولنے کو تیار نہیں ہیں۔ وہ واقعہ کیسے پیش آیا اس کی وجوہات کیا تھیں؟ اس کے بارے میں اگلے صفحات میں کچھ میں مزید عرض کروں گا۔ فی الحال اتنا ہی کہ ہم اس گولڈن ٹیمپل کے پاس سے گزر رہے تھے جہاں بیس سال پہلے خالصتان کے حامیوں کو قتل کیا گیا تھا۔

بٹالہ: آئرن برڈ آف ایشیاء

ہم گیارہ بجے کے قریب امرتسر سے گزر رہے تھے اور ہمیں سفر کرتے کرتے کافی وقت ہو چکا تھا۔ شروع میں تو سب لوگ ہی خوف زدہ اور خاموش تھے لیکن اب آہستہ آہستہ بچے آپس میں باتیں بھی کرنا شروع ہو گئے اور شرارتیں بھی۔ ہم نے اپنی بس میں موجود پاکستانی بس کنڈیکٹر سے پوچھا کہ ہمارا اگلا سٹاپ کہاں ہے؟ اس نے بتایا کہ ہم سرہند میں دوپہر کے کھانے کے لیے اور بعد میں پیلی ہریانہ میں چائے کے لیے رکیں گے۔

سرہند میں جس ریستوران میں ہم نے کھانا کھایا وہ دنیا بھر میں اپنی نوعیت کا عجیب و غریب ریستوران ہے۔ مجھے دوبارہ کسی ایسے ریستوران میں جانے کا اتفاق نہیں ہوا اور نہ ہی میں کبھی کسی ایسے شخص سے ملا جو اس طرح کے کسی منفرد ریستوران میں گیا ہو۔

جون کا مہینہ اور دوپہر کا وقت تھا ہمیں کچھ دیر بعد ایک ریستوران میں رکنا تھا جس کا سب کو شدت سے انتظار تھا۔ میں نے نقشے میں دیکھا تو مجھے معلوم ہوا کہ امرتسر شہر سے آٹھ مختلف شہروں کو سڑکیں نکلتی ہیں، ایسا کم ہی ہوتا ہے۔ ہم اس سے اس بات کا اندازہ کر سکتے ہیں کہ جنھوں نے امرتسر کو بسانے کا فیصلہ کیا انھیں علم تھا کہ یہ جگہ پنجاب میں ایک مرکزی حیثیت رکھتی ہے۔

امرتسر سے نکلنے والی سب سے اہم سڑک وہ ہے جو بٹالا اور گرداسپور سے ہوتی ہوئی پٹھان کوٹ اور پھر اس کے بعد کشمیر جاتی ہے۔ یہ سڑک پاکستانی سرحد کے ساتھ ساتھ چلتی ہے اور نارووال شکرگڑھ کے قریب سے ہوتی ہوئی کشمیر تک جاتی ہے۔ بھارت سے کشمیر کو یہی سڑک ملاتی ہے۔ میں نے نقشے میں دیکھا کہ بٹالہ شہر ہمارے شمال مشرق کی جانب ہے۔ بٹالہ شہر سے پاکستان کے لوگوں کی کئی یادیں وابستہ ہے۔

اگر آپ کو یاد ہو تو لاہور میں ایک بہت بڑی انجینئرنگ کمپنی ہے جس کا نام پیکو ہے، پاکستان انجینئرنگ کمپنی۔ اس کا پرانا نام بیکو، یعنی بٹالہ انجینئرنگ کمپنی تھا۔ اس کے مالک سی ایم لطیف تھے جن کا گھر لاہور میں گورنر ہاؤس اور الحمرا کے درمیان واقع ہے۔ یہ اپنے وقت کی بہت ہی اہم انجینئرنگ کمپنی تھی۔ اگر ذوالفقار علی بھٹو اسے قومی تحویل میں نہ لیتے تو وہ کمپنی اب تک اپنا ہوائی جہاز بنا چکی ہوتی۔ اس کمپنی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ جب بھی کوئی غیر ملکی سربراہان آتے تو انھیں اس فیکٹری کا دورہ کروایا جاتا تھا۔ چینی صدر کے دورے کے موقع پر انھوں نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ چینی طلباء کو بھی یہاں پر تربیت دینے کا بندوبست کیا جائے۔

اگر آپ کو پنجابی شاعری سے دلچسپی ہو تو آپ کو علم ہوگا کہ پنجابی کے ایک مشہور شاعر شیو کمار بٹالوی کا تعلق بھی اسی شہر سے تھا۔ وہ شکرگڑھ میں پیدا ہوئے لیکن تقسیم کے وقت وہ گیارہ سال کی عمر میں بٹالہ آ گئے تھے اور ستائیس سال کی عمر میں ان کی موت

واقع ہو گئی۔ انھیں پنجابی کے پہلے پانچ شاعروں میں گنا جاتا ہے۔ ان کے یہ مشہور اشعار نصرت فتح علی خاں صاحب نے بھی گائے ہیں۔

مائے نی میرے گیتاں دے نیناں وچ

برہوں دی رڑک پوے

ادھی ادھی راتیں

اٹھ روئن موئے متراں نوں

مائے سانوں نیند نہ پوے

مائے نیں مائے، میرے گیتاں دے نیناں وِچّ، برہوں دِی رِڑک پوے

(اے ماں! میرے گیتاں وچ وی جُدائی رِڑک دی ہے یعنی جُدائی دا غم نظر آؤندا ہے۔)

اَدھی اَدھی راتیں، اُٹھ رون موئے متراں نوں، مائے سانوں نیند نہ پوے

(اَدھی اَدھی رات نوں مَرے یا پچھڑے ہوئے دوستاں نوں یاد کر کے رونا آؤندا ہے تے نیند نہیں آؤندی اے ماں۔)

بھیں بھیں سُگندھیاں وِچّ، بُنھاں پھیہے چاننی دے، تاں وی ساڈِی پیڑ نہ سَہوے

(میں خوشبوواں وِچّ بھیں بھیں کے چاننی دے پھاہے بنھدی ہاں پر پھیر وِی میرا دُکھ سَہن نہیں ہُندا)

کوسے کوسے ساہواں دِی، میں کراں جے ٹکور مائے، سگوں سانُوں کھان نُوں پوے

(گرم گرم ساہواں دِی گرمی وی سکون نہیں دیندی سگوں مینُوں کھان نوں پیندی ہے۔)

آپے نی میں بالڑی، میں ہالے آپ مَتاں جوگی، مَت کیہڑا ایس نُوں دوے

(میں تے آپ ہالے نکی بالڑی یعنی کم سن ہاں کہ مینُوں کوئی مَت دیووے، تے میں ایہنوں کِتھوں مَت دین جوگی ہاں۔)

Sive Kumar Poem Photo Credit:
http://punjabiandpunjab.com

تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ 1465ء میں راجہ رام دیو، جو ایک بھٹی راجپوت تھا، نے اس شہر کی بنیاد رکھی تھی۔ شاید اسی وجہ سے اس کا نام بٹیالہ رکھا گیا ہو۔ بعد ازاں اکبر بادشاہ نے اپنے ایک منہ بولے بھائی شمشیر خان کو اس علاقے میں ایک جاگیر بھی دی۔ بٹیالہ امرتسر سے سو سال پرانا شہر ہے۔ شروع میں یہ شہر ایک قلعے میں تھا اور جس کے بارہ دروازے تھے۔ ایک اور دلچسپ بات یہ بھی ہے کہ بابا گرونانک کی شادی بھی اسی شہر میں ہوئی تھی۔ اب بھی ہر سال ان کی شادی کا جشن منایا جاتا ہے۔ یہاں پر سکھوں کے کئی گردوارے ہیں۔

تقسیم ہند سے قبل اس شہر کی پچاس فیصد آبادی مسلمانوں پر مشتمل تھی۔ تقسیم ہند کے وقت پہلا فارمولا یہ تھا کہ جس صوبے میں مسلمانوں کی اکثریت ہو گی وہ پاکستان کا حصہ ہو گا۔اس طرح پورا پنجاب پاکستان کا حصہ ہونا تھا لیکن بعد میں یہ تقسیم ضلعی بنیادوں پر ہونے لگی۔ اس کے مطابق جس ضلع میں مسلمانوں کی اکثریت ہو گی اور وہ پاکستانی سرحد سے ملتا ہوگا تو تب ہی پاکستان کا حصہ ہوگا۔اس کے بعد یہ تقسیم تحصیل کی سطح پر ہونے لگی۔ اس وجہ سے ضلع گرداسپور کی تین تحصیلیں گرداس پور، بٹالہ اور پٹھان کوٹ کو بھارت کا حصہ بنا دیا گیا اور اس کی ایک تحصیل شکرگڑھ کو پاکستان میں شامل کیا گیا۔ اگر انگریز ایسا نہ کرتا تو بھارت کو کشمیر جانے کا کوئی راستہ نہ ملتا۔

بٹالہ میں سکھ آبادی کا 98 فیصد سے بھی زائد ہے۔ ایک فیصد کے قریب ہندو جبکہ مسلمانوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے۔ تقسیم سے قبل اس شہر میں مسلمان آبادی کا پچاس فیصد تھے۔ اب تک مجھے بھارت میں جتنے بھی شہروں کے بارے میں جاننے کا موقع ملا ہے ان میں یہ واحد شہر ہے جہاں سکھ اتنی بڑی تعداد میں رہتے ہیں۔ اس علاقے میں لوہے کے ذخائر بھی پائے جاتے ہیں جس کی وجہ سے اس شہر میں لوہے کی بہت سی فیکٹریاں بھی ہیں۔ اسی وجہ سے اسے آئرن برڈ آف ایشیاء کا نام بھی دیا گیا ہے.

یہاں پر بڑی تعداد میں مشینری بنائی جاتی ہے، یہی وجہ ہے کہ یہاں سے ہجرت کر کے جانے والے سی ایم لطیف نے بٹالہ انجینئرنگ کمپنی بنائی جو اپنے زمانے کی ایک بہت ہی معروف کمپنی تھی۔ پاکستان کے اعجاز حسین بٹالوی بھی ایک بڑے مشہور وکیل اور ادبی شخصیت تھے، ان کا تعلق بھی اسی شہر سے تھا۔ ممتاز مفتی بھی اسی شہر کے رہنے والے تھے۔ یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ریڈیو

پاکستان کی پہلی براڈ کاسٹر اور اینکر موہنی حمید، جنھیں شمیم آپا بھی کہا جاتا تھا کا تعلق بھی اسی شہر سے تھا۔

China’s Prime Minister Chou en lai and Mr. Schneider with CM Latif getting a tour of BECO. Photo Credit: https://moeedi.wordpress.com

میں لاہور کے جس علاقے میں رہتا ہوں پیکو بھی اسی علاقے میں واقع ہے۔ ہم ایک تاریخی شہر کے پاس سے گزر رہے تھے۔ میں نے شمال مشرق کی طرف دیکھا کہ یہاں سے ایک شخص نے لاہور جا کر ایک بہت بڑی کمپنی بنائی اور پھر ہم نے اسے کھو دیا اور اب اس کا نام بھی کم ہی سننے کو ملتا ہے۔

بٹالہ سے تعلق رکھنے والے لوگوں نے فیصل آباد میں بٹالہ انجینئرنگ کے نام سے زرعی مشینری بنانے کی کئی فیکٹریاں لگا رکھی ہیں۔

دریائے بیاس: تقسیم ہند کے وقت اجاڑے کا ایک عینی گواہ

امرتسر سے گزر کر ہمیں جالندھر پہنچنا تھا جہاں ہم نے کچھ دیر کے لیے رکنا تھا۔ میں نے نقشے میں دیکھا کہ امرتسر سے پچیس کلومیٹر کے فاصلے پر جالندھر سے پہلے دریائے بیاس بہتا ہے اور وہیں پر بیاس نام کا ایک قصبہ بھی موجود ہے۔

میں اس دریا کو ایک مدت سے دیکھنا چاہتا تھا۔ جس کی ایک خاص وجہ تھی اور وہ یہ کہ میرے دادا کے دو بھائی، محمد اسماعیل اور محمد سلیمان اپنے آٹھ بھائیوں میں سب سے چھوٹے تھے۔ محمد سلیمان سب سے چھوٹے تھے۔ جب اجاڑا شروع ہوا تو وہ دور کسی گاؤں میں تھے۔ یاد رہے ہمارے والدین نے کبھی بھی ہجرت یا نقل مکانی کا لفظ استعمال نہیں کیا تھا۔ وہ تقسیم کو پاڑے اور ہجرت کو اجاڑے دونوں پنجابی کے الفاظ ہیں، کہتے تھے اجاڑا اجڑنے کو اور پاڑا، کسی چیز کو کئی حصوں میں تقسیم کرنے کو کہتے ہیں۔

تقسیم ہند کے بعد، انھوں نے تقریباً تین سال تک اسی آس میں گزارے کہ امن ہو جائے گا اور وہ واپس چلے جائیں گے۔ ان کا یہ کہنا تھا کہ گدی پر بیٹھا راجا تو بدلتا ہے لیکن راج نہیں بدلتا۔ انگریزوں کی بجائے سکھ یا ہندو حکمران تو ہو سکتے ہیں لیکن تاریخ میں رعایا تو کبھی بھی نہیں بدلی۔ ہم تو صدیوں سے رعایا تھے اور ہم تو اسی دیس کی رعایا رہیں گے۔ میرے بزرگوں نے کبھی ہندوستان کا لفظ استعمال نہیں کیا۔ جب بھی اپنے شہر سرہند کا ذکر کیا یہی کہا کہ ہمارا دیس۔

سرہند سے محبت کی نشانی کے طور پر سرہند سے آنے والے لوگوں نے ٹوبہ ٹیک سنگھ سرہند کالونی بنائی اور اپنے آپ کو سرہندی کہلوایا۔ آج بھی ہمارے گھروں پر سرہندی لکھا ہوا ہے اور کئی لوگوں کے نام کا لاحقہ بھی سرہندی ہے۔ جب امن کے دور میں ٹوبہ ٹیک سنگھ کے لوگوں کی ایک کثیر تعداد مجدد الف ثانی کے سالانہ عرس میں شرکت کے لیے جاتی تھی۔

میں دریائے بیاس سے جڑی ایک یاد کا ذکر کر رہا تھا کہ سب لوگوں نے محمد اسماعیل اور محمد سلیمان سے کہا کہ آپ شہر کی طرف نہ جائیں کیونکہ وہاں بہت قتل و غارت ہو رہی ہے۔ وہ کھیتوں میں چھپتے چھپاتے کئی روز کے سفر کے بعد انبالہ چھاؤنی پہنچ گئے۔ان دنوں انبالہ چھاؤنی میں ایک بڑا کیمپ لگا ہوا تھا، جو تقسیم ہند کے کئی سال بعد بھی قائم رہا، جہاں اغوا شدہ بچوں اور عورتوں کو لا کر رکھا جاتا تھا اور انھیں پاکستان بھیجنے کا بندوبست کیا جاتا تھا۔ میرے وہ دونوں بزرگ اس کیمپ میں کئی ماہ تک رہے۔ بعد ازاں ایک دن وہ ٹرین پر سوار ہو کر لاہور کی طرف چل پڑے۔

میں نے ان بزرگوں سے اس گاڑی کے سفر سے متعلق بہت کچھ سن رکھا تھا۔ اس گاڑی کے سفر میں دریائے بیاس کا سفر بھی آتا تھا۔اس وجہ سے مجھے اس دریا کو دیکھنے کا بہت شوق تھا۔

محمد اسماعیل صاحب میرے دادا کے چھوٹے بھائی جنہیں ہم بابا جی کہتے تھے، ایک دن مجھے ان سے طویل گفتگو کا موقع ملا۔ انھوں نے بتایا کہ جب ان کی گاڑی دریائے بیاس پر سے گزر رہی تھی تو ان دنوں دریا میں زبردست سیلاب آیا ہوا تھا۔ انھوں نے دیکھا کے دریا کے آس پاس بے شمار گڑھے پڑے ہیں۔ جانوروں اور انسانوں کی لاشوں کی باقیات بھی جا بجا دکھائی دے رہیں تھیں۔ کئی لاشیں تو درختوں سے لٹکی ہوئی تھیں۔ یوں لگتا تھا کہ سیلاب کی وجہ سے ایسا ہوا ہے۔لوگوں نے دریا عبور کرنے کی کوشش کی ہو گی۔ اب پانی تو کم ہو گیا لیکن لاشیں درختوں کے ساتھ ہی رہ گئیں۔ایسے کئی واقعات کی انھوں نے کچھ اس طرح سے منظر کشی کی کہ میرے اندر دریائے بیاس کو دیکھنے کی شدید خواہش پیدا ہوئی۔

میں دریا سے گزرتے ہوئے بابا اسماعیل صاحب کی وہ گفتگو دہرا رہا تھا جو انھوں نے مجھ سے کی۔

آج میری یہ خواہش پوری ہو رہی تھی ۔۔۔ اور وہ زخم بھی تازہ ہو رہے تھے جو میرے بزرگوں کے جسموں اور روحوں پر لگے تھے۔۔۔ انکی ٹیسیں آنے والی کئی نسلیں بھگتیں گی۔۔۔ میں ان کی تیسری نسل میں سے ہوں۔۔۔ میں یہ درد شدت سے محسوس کر رہا ہوں ۔۔۔ اور میری یہ تحریر اس درد کو اگلی نسل تک پہنچانے کی ایک کوشش ہے۔

اس کے علاوہ انھوں نے مجھے بتایا کہ جیسے ہی ان کی گاڑی نے دریا عبور کیا ۔ ڈرائیور نے ایک ویرانے میں گاڑی کو روک دیا۔ جیسے ہی ٹرین رکی، بے شمار لوگوں نے ،جن میں اکثریت سکھوں کی تھی، ان پر حملہ کر دیا۔ اس ٹرین میں جتنے بھی لوگ تھے ان میں سے صرف وہی بچے جو اس ڈبے میں تھے جس میں محمد اسمٰعیل اور ان کے چھوٹے بھائی تھے۔ ان کی بچنے کی وجہ صرف یہ تھی کہ اس ڈبے میں چند گورکھا سپاہی تھے جن کے پاس ہتھیار تھے۔ اسی وجہ سے حملہ کرنے والے اس ڈبے سے دور ہی رہے۔

باقی کسی کو کوئی بچانے والا نہیں تھا۔۔۔ سب مارنے والے تھے۔۔۔ جب سب مار دیے گئے پھر لاشوں بھری گاڑی کو لاہور کی طرف روانہ کر دیا گیا۔

آج میں انھیں دو مقامات کو دیکھ رہا تھا۔ جہاں اس قدر خون بہایا گیا کہتے ہیں کہ بیاس بھی سرخ ہو گیا تھا۔

ایک درد بھری نظم کی چند اشعار

(میں نے یہ نظم افضل کمیانہ کے فیس بک پیج سے لی ہے اور انھوں نے شاعر کا نام ارشاد سندھو لکھا ہے۔

چونکڑیاں چوبارے رہ گئے ادھے ایدھر ادھے اودھر
ساڈے چمن تے تارے رہ گئے ادھے ایدھر ادھے اودھر
ونڈاں پاکے ہسن والے اج اُس ماں دا جرم تے دسن
جہدے راج دُلارے رہ گئے ادھے ایدھر ادھے اودھر
خورے کہڑی کہڑی تھاں تے رُلیاں لیکھاں سڑیاں بھیناں
لبھدے ویر پیارے رہ گئے ادھے ایدھر ادھے اودھر
قسمے ویکھے نیں میں اک دُوجے دی حالے وی راہ تکدے
جہڑے لیکھاں ہارے رہ گئے ادھے ایدھر ادھے اودھر
رہ گئے کئی کرتارے تے کئی کوراں اک دوجے نوں لبھدے
کنے داری دارے رہ گئے ادھے ایدھر ادھے اودھر
کسّے نوں کیہ دسیے ساڈی اوہ وی گل نہ پوری ہوئی
جہڑی گل دے مارے رہ گئے ادھے ایدھر ادھے اودھر
ازلاں دے ساں ساتھی پرائے ساتھ نہ نبھیا ساتھوں
وعدے بن کے لارے رہ گئے ادھے ایدھر ادھے اودھر

Bias River during The Partition Photo Credit:
https://twitter.com/1947partition/status

دریائے بیاس جسے سکندر بھی پار نہ کر سکا

اس سے پہلے کہ میں آپ کو بیاس کے کنارے بیاس قصبے میں موجود ایک نئے مذہب کے بارے میں کچھ بتاؤں، میں چاہوں گا کہ آپ کو اس دریائے بیاس کی تاریخ سے آگاہ کیا جائے جو ہندوؤں کے نزدیک ایک مقدس دریا مانا جاتا ہے۔

دریائے بیاس پنجاب کے ان پانچ دریاؤں میں شامل ہے جس کی وجہ سے پنجاب کو پنجاب کہا جاتا ہے۔ یہ ان پانچ دریاؤں میں سے سب سے چھوٹا دریا ہے اس کی لمبائی 470 کلومیٹر ہے. یہ ہماچل پردیش سے شروع ہو کر امرتسر کے شمال مغرب میں

دریائے ستلج میں شامل ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد دریائے ستلج قصور کے قریب سے پاکستان میں داخل ہوتا ہے اور پھر ملتان کے بعد یہ بڑے دریاؤں میں شامل ہو کر پنجند کے مقام پر دریائے سندھ میں جا گرتا ہے۔

لاہور سے جاتے ہوئے امر تسر کے بعد پہلا دریا یہی آتا ہے۔ اس کے بعد لدھیانہ سے آگے دریائے ستلج گزرتا ہے۔ ہندوؤں کے نزدیک یہ ایک بہت مقدس دریا ہے۔ تاریخ میں اس کے کئی نام ملتے ہیں۔ اس دریا سے جڑا ہوا سب سے اہم واقعہ یہ ہے کہ ہندوؤں کے ایک بہت بڑے راہنما رشی وشیشا تا نے ایک مرتبہ اپنی روح پاک کرنے کے لیے اپنے آپ کو رسیوں سے باندھ کر دریا میں چھلانگ لگا دی لیکن جیسے ہی وہ دریا میں گرے تو رسیاں ٹوٹ گئیں اور وہ بچ گئے جس کے بعد انھوں نے اس دریا کا نام ویشترا یعنی رسیا توڑنے والا رکھ دیا۔ انھوں نے اپنی رہائش بھی اسی دریا کے پاس رکھی اور بعد میں ہندومت کے اندر ایک اہم مقام پر بھی فائز رہے۔

اس دریا کی بہت اہم تاریخی حیثیت بھی ہے جس کی کڑی سکندر کے حملوں سے جڑی ہوئی ہے۔ آپ سب جانتے ہیں کہ سکندر چوتھی صدی قبل مسیح میں ہندوستان پر حملہ آور ہوا اور اس کی پہلی لڑائی دریائے جہلم کے کنارے راجا پورس سے ہوئی۔ جس میں کوئی فیصلہ نہیں ہوا تھا لیکن بعد میں اس نے پنجاب کے کئی علاقے بھی فتح کیے۔ تاریخ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ جب اس کی فوج بیاس کے کنارے پہنچی تو اس نے اس مقام سے آگے جانے سے انکار کر دیا۔

اس کی کیا وجہ تھی؟ اس بارے میں لوگوں کے مختلف خیالات ہیں۔ جن میں ایک یہ بھی ہے کہ سکندر کے فوجی جنگ سے تھک گئے تھے۔ کچھ لوگوں کا یہ خیال بھی ہے کہ مقامی لوگوں کی طرف بہت زیادہ مزاحمت تھی۔ اب تک جو میں نے جانا ہے اسکے مطابق میرا خیال ہے کہ دریا کا بہاؤ اور مقامی لوگوں کی سخت مزاحمت ہی اسی کی واپسی کا سبب بنی تھی۔

صحیح بات کیا ہے۔۔۔یقین سے کچھ کہنا مشکل ہے۔

ہمیں بھی اس دریا سے بہت کچھ جاننے کو ملتا ہے اور ہم بھی بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ اس دریا پر کئی ڈیم بھی بنائے گئے ہیں۔ جن سے کئی نہریں نکالی گئی ہیں اور دو ہزار میگا واٹ سے زیادہ بجلی بھی پیدا کی جا رہی ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ یہ دریا 14ہزار فٹ کی بلندی سے شروع ہوتا ہے۔ جس سے پانی کا بہاؤ بہت تیز ہو جاتا ہے جو بجلی پیدا کرنے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔ یہ بات بھی اہم ہے کہ ایوب اور نہرو کے درمیان ہونے والے سندھ طاس معاہدے کے مطابق جو تین دریا بھارت کو دیے گئے تھے ان میں راوی اور ستلج کے ساتھ ساتھ بیاس بھی شامل تھا۔

اب صورت حال یہ ہے کہ عام دنوں میں بھارتی اس پانی سے مستفید ہوتے ہیں اور سیلاب کی صورت میں یہ دریا پاکستان میں تباہی پھیلاتے ہیں۔

بیاس: جہاں ایک نئے مذہب کی بنیاد رکھی گئی

دریائے بیاس کے کنارے ضلع امرتسر میں جی ٹی روڈ پر بیاس نام کا ایک قصبہ بھی ہے۔ یہ قصبہ ریاست کپور تھلہ سے تقریباً پچیس کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ جالندھر سے اس کا فاصلہ تقریباً چالیس کلومیٹر ہے۔ یوں تو یہ ایک عام سا قصبہ ہے لیکن اس کی اصل وجہ شہرت یہاں واقع رادھا سوامی ستسنگ بیاس، جسے عام طور پر آر ایس ایس بی بھی کہا جاتا ہے کا مرکز ہے، اسے ڈیرہ بابا جیمل سنگھ بھی کہتے ہیں۔ یہ ایک بین الاقوامی تنظیم ہے۔ جس کا ایک مختصر تعارف پیش خدمت ہے۔

تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ 1891ء میں آر ایس ایس بی کی بنیاد رکھی گئی، جب سوامی شیو دیال سنگھ جی نے بابا جیمل سنگھ جی کو دریا کے پاس گیان کرنے کو کہا۔ اس کا آغاز ایک جھونپڑی سے کیا گیا۔ بعد ازاں بے شمار لوگوں نے اس نظریے کو اپنایا۔ سوامی

جی کے لباس سے لگتا ہے کہ وہ سکھ نہیں تھے لیکن موجودہ گورو، بابا گرندر سنگھ ،جو مہاراج چرن سنگھ جی کے پیروکار ہیں کے لباس سے لگتا ہے کہ ان کا تعلق سکھ مت سے ہے۔

یہ لوگ اس بات کے قائل ہیں کہ ہم سب کا رب ایک ہی ہے جو ہمارے اندر رہتا ہے۔آپ کسی بھی دھرم یا مذہب سے تعلق رکھتے ہوں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ انسانی زندگی کا سب سے بڑا مقصد خدا کی الوہیت کا تجربہ کرنا ہے جو ہم سب کے اندر رہتا ہے۔ یہ جان کر ہی ہم اس حقیقت کو محسوس کر سکتے ہیں کہ صرف ایک خدا موجود ہے اور ہم سب اس کی محبت کا اظہار ہیں۔

Slogan of RSSB Photo Credit: https://www.youtube.com

یہ لوگ روحانی طور پر صفائی کے بے حد قائل ہیں اور وہ یہ کام کسی استاد کی نگرانی میں کرتے ہیں۔ اس کے لیے وہ روزانہ گیان اور کئی دوسرے عمل بھی کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ کسی بھی طرح کا گوشت نہیں کھاتے۔ان کا کہنا ہے کہ ایسا کرنے سے آپ کو زندگی سے پیار ہو گا۔ ان کے ہاں صرف پھل اور سبزیاں ہی کھائی جاتی ہیں وہ ہر طرح کے نشے سے پرہیز کرتے ہیں۔۔اس کے علاوہ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ آپ ہندو ہو یا سکھ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اصل بات من کی صفائی ہے۔ میں نے ان کی کئی وڈیوز دیکھی ہیں جن میں صرف صفائی اور نیک کام کرنے پر ہی زور دیا جاتا ہے۔

یہ ایک تاریخی قصبہ ہے۔ ہم اس کے پاس سے گزر رہے تھے اور سرہند کے اس ریستوران کا انتظار کر رہے تھے جہاں ہمیں رکنا تھا۔ بچے بھی تھوڑے پریشان ہو رہے تھے۔ کیونکہ میری دلچسپی ارد گرد کے ماحول کو دیکھنے میں ہوتی ہے اس لیے مجھے زیادہ پریشانی نہیں تھی لیکن بچوں کی پریشانی تو ہوتی ہی ہے۔

کپور تھلہ، سلطان پور اور کرتار پور

دریائے بیاس عبور کرنے کے بعد ہمارے راستے میں پہلا قابل ذکر قصبہ کرتارپور آیا۔ یاد رہے نارووال کے پاس کرتارپور گردوارہ صاحب بھی موجود ہے جو بھارتی سرحد کے بالکل قریب ہے۔ ابھی حال ہی میں بھارتی لوگوں کو اس گردوارے تک رسائی دینے کے لیے ایک راہداری بنائی گئی ہے۔

ہمارے دائیں طرف دو اہم شہر کپور تھلہ اور سلطان پور لودھی تھے۔ قابل احترام میاں طفیل محمد صاحب کا تعلق بھی کپور تھلہ سے ہی تھا۔ جبکہ سلطان پور لودھی، لودھی خاندان کے ایک حکمران کے نام پر رکھا گیا تھا۔

اگر مزید بائیں طرف دیکھیں تو ایک سڑک فیروزپور کی طرف اور وہاں سے آگے قصور تک جاتی ہے۔ یہ وہی فروزپور ہے جس کے نام پر لاہور میں فیروز پور روڈ ہے۔ فیروزپور کی بنیاد سلطان فیروز تغلق نے رکھی۔ ہمارے بائیں طرف، یعنی شمال مشرق کی جانب دسوعہ، ہریانہ اور ہشیارپور کے علاوہ بھی کئی اہم شہر موجود تھے۔ ان سب کا تعارف تو ممکن نہیں لیکن میں چند ایک کا تعارف آپ کی خدمت میں ضرور پیش کرنا چاہوں گا۔

کرتارپور: بابا گورو نانک کی یاد میں بسا شہر

کرتارپور جالندھر سے پندرہ کلومیٹر پہلے جی ٹی رود پر واقع ہے۔ تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ اس کی بنیاد سکھوں کے پانچویں گرو شری گروارجن دیو جی نے رکھی تھی۔ اس

کا یہ نام رکھنے کی وجہ کرتار پور نارووال کے نزدیک واقع گرونانک کے نام کا گردوارہ ہے۔ شاید انھوں نے گرونانک صاحب کی محبت میں ہی اس جگہ کا نام کرتار پور رکھا ہو۔ یہ میرا خیال ہے، ممکن ہے درست نہ ہو۔ یہ چھوٹا سا قصبہ ہے۔ ہم جب وہاں سے گزرے تو میں نے دیکھا کہ وہ بالکل ہمارے ہاں پنجاب میں بنے قصبے کی طرح تھا۔ کوئی فرق نہیں تھا اور ہو بھی نہیں سکتا تھا۔

اس وقت تو مجھے معلوم نہیں تھا لیکن ابھی جب میں نے اس کے بارے میں پڑھا تو مجھے شہر سے متعلق ایک اور اہم بات بھی جاننے کا موقع ملا۔ 2014ء میں اس شہر میں جنگ آزادی میں شہید ہونے والے لوگوں کی یاد میں پچیس ایکڑ پر پھیلا ایک میوزیم بنایا گیا۔ اس وقت یہ ایک بہت بڑی بلڈنگ ہے۔ یہاں ایک شہیدی مینار بھی بنایا گیا ہے جو کافی دور سے بھی نظر آتا ہے۔

اس شہر سے گزرتے ہوئے مجھے یاد آیا کہ میرے بچپن میں ہمارا گھر ٹوبہ ٹیک سنگھ میں لکڑ منڈی کے پاس تھا۔ وہاں پر ایک صاحب، جنہیں ہم مستری بابا جی کہتے تھے، فرنیچر وغیرہ کا کام کرتے تھے۔ گھر کے قریب ہونے کی وجہ سے ہمارا ان کے پاس کافی آنا جانا تھا۔ انھوں نے ایک دفعہ مجھے بتایا تھا کہ ہندوستان بھر میں تین شہر ایسے تھے جہاں پر فرنیچر کا بہت ہی خوبصورت کام ہوتا تھا۔ ان میں کرتار پور، شکار پور سندھ اور چنیوٹ شامل ہیں۔ مجھے ایک مرتبہ شکار پور جانے کا موقع ملا۔ میں نے وہاں کسی سے پوچھا تو علم ہوا کہ وہ کام اب یہاں پر زیادہ نہیں ہوتا البتہ چنیوٹ اب بھی فرنیچر کے لیے بہت مشہور ہے۔ کرتار پور کا فرنیچر بھی بہت شاندار مانا جاتا ہے۔

اس طرح مجھے اس شہر سے گزرتے ہوئے وہ بزرگ بھی یاد آئے جو ہم بچوں سے بے حد پیار کرتے تھے۔ اس وقت ہماری سب سے بڑی عیاشی یہ ہوتی تھی کہ وہ ہمیں گلی ڈنڈا بنا کر دیتے تھے۔ یہ کرکٹ سے پہلے کی بات ہے جب ایک گلی اور ایک ڈنڈے سے

پورے محلے کے بچے کھیلتے رہتے تھے۔ ہمارے بچپن کا کھیل بھی یہی گلی ڈنڈا ہی تھا۔اب بھی دور دراز دیہات میں یہ کھیل کھیلا جاتا ہے لیکن شہری علاقوں میں گلی ڈنڈا قصہ پارینہ بن چکا ہے۔

کپور تھلہ: جہاں سکھ راجہ نے ایک عالیشان مسجد بھی بنائی

کرتار پور سے کپور تھلہ کا فاصلہ تقریبا پندرہ کلومیٹر کا ہے اور یہ اس کے جنوب مغرب میں واقع ہے. جالندھر سے اس کا فاصلہ پچیس کلومیٹر ہے۔ پہلی مرتبہ کپور تھلہ کے نام کے بارے میں میاں طفیل محمد صاحب ،سابق امیر جماعت اسلامی کی سوانح عمری پڑھتے ہوئے جاننے کا موقع ملا۔

میں نے کپور تھلہ سے متعلق مزید جانا تو مجھے بہت ہی دلچسپ باتوں کا علم ہوا۔ اس شہر سے عقیدت ایک تو میاں صاحب کی وجہ سے تھی اور دوسرا جب میں نے اس شہر پر حکمرانی کرنے والے لوگوں کے بارے میں پڑھا تو مجھے اندازہ ہوا کہ یہ وہ لوگ ہی تھے جو حکمرانی کے لائق تھے اور انھوں نے حکمرانی کا حق بھی ادا کیا۔ابھی حال ہی میں جب میں نے اس سے متعلق مختلف ویڈیوز دیکھیں تو وہ بھی بہت حیران کن تھیں۔ بہت سے لوگ اسے پنجاب کا پیرس کہتے ہیں اور یہ بات غلط بھی نہیں ہے۔

کپور تھلہ ریاست تقریباً دو سو سال تک قائم رہی۔ یہ ایک بہت ہی چھوٹی ریاست تھی۔ جس کا رقبہ ساڑھے تین سو مربع کلومیٹر تھا جبکہ بیسویں صدی کے آغاز میں اس کی آبادی تین لاکھ کے قریب تھی۔ یہ ریاست 1772ء میں قائم ہوئی اور 1949ء میں یہ بھارت میں ضم ہو گئی۔ میں اس کا کچھ احوال بھی آپ کے سامنے رکھنا چاہتا ہوں۔اس ریاست کے بارے میں مجھے ایک ایسی بات بھی جاننے کو ملی جس کی مثال پورے بھارت

میں کہیں اور نہیں ملتی۔اس کام کی وجہ سے اِس ریاست کے سکھ راجا کے حصے میں بہت زیادہ نیک نامی بھی آئی۔

تاریخی کتابوں سے یہ جاننے کو ملتا ہے کے پہلی صدی عیسوی میں خراسان سے آنے والے لوگوں نے ،جو دراصل رومی نسل کے لوگ تھے، اس علاقے پر حملہ کیا تھا۔ ان جنگوں میں کرشنا کا ذکر بھی ملتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس کے ایک بیٹے، جس کا نام سالی باہن تھا، نے سیالکوٹ شہر کی بنیاد رکھی تھی۔ یہ بہت قدیم تاریخ ہے جس میں بہت سی باتیں واضح نہیں ہیں۔

تیرہویں صدی میں جب مسلمانوں نے پنجاب فتح کیا تو یہاں کے مقامی لوگ راجستان کی طرف نقل مکانی کر گئے۔اس وقت راجستھان میں جیسلمیر نامی ایک ریاست موجود تھی۔ پھر ایک وقت آیا جب علاؤالدین خلجی نے جیسلمیر کو بھی فتح کر لیا جس کے نتیجے میں یہاں کے لوگ کئی علاقوں تک پھیل گئے۔ وہ لوگ جاٹ کہلاتے تھے۔ پھر جب سکھوں نے سترہویں صدی میں مغلیہ حکومت کے خلاف جنگ کی تو انھوں نے گورو ہر گوبند صاحب کی فوج میں شمولیت اختیار کر لی اور لاہور پر حملہ کرنے والی فوج کا ایک اہم حصہ بن گئے۔

اس وقت لاہور کا گورنر دلاور خان تھا۔ وہ ان کی بہادری سے بے حد متاثر ہوا اور ان سے صلح کی کوشش کی۔ صلح ہو گئی، جس کے بدلے میں دلاور خان نے انھیں ایک بڑی جاگیر دی، جس میں ایک گاؤں آہلو بھی تھا۔ اس گاؤں کی وجہ سے ان کا نام آہلو والیہ پڑ گیا۔ اس خاندان نے آگے جا کر کپور تھلہ ریاست کی بنیاد رکھی جسکے سب راجے آہلو والیہ کہلواتے تھے۔

اس ریاست کے بانی کا نام سردار جسا سنگھ آہلووالیا تھا۔ جو سردار کے علاوہ سلطان القوم، نواب اور بابا بھی کہلواتا تھا۔ وہ ایک مذہبی آدمی تھا۔ سکھوں کے نزدیک وہ ایک نہایت ہی قابلِ احترام شخص کے طور پر جانا جاتا ہے۔ اس نے 1772ء میں کپور تھلہ ریاست کی بنیاد رکھی۔ یہ ریاست تقسیم ہند تک قائم رہی۔ اس کی تاریخ بھی بہت ہی دلچسپ ہے۔

اس کے سب سے آخری راجا سر جگجیت سنگھ صاحب بہادر تھے جو 1872ء سے 1949 تک، ستر سال سے زائد، اس ریاست کے حکمران رہے۔ وہ ایک بھٹی راجپوت خاندان میں پیدا ہوئے تھے۔ انھوں نے اس شہر میں بے شمار محلات، باغات اور تعلیمی ادارے بنوائے۔ یہاں پہلی مرتبہ سیوریج کے نظام کے علاوہ کئی دیگر اصلاحات بھی کیں جنھیں آج بھی عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

انھیں پہلی مرتبہ 1877ء میں کسی کی نگرانی میں پانچ سال کی عمر میں گدی پر بٹھایا گیا تھا۔ جب وہ بالغ ہو گئے تو 1890ء میں انھیں کپور تھلہ کا راجا تسلیم کر لیا گیا۔ یہ ریاست انگریزوں کی ایک طفیلی ریاست تھی۔

مہاراجہ جگجیت سنگھ نے ریاست میں رہنے والے مسلمانوں کے لیے ایک بڑی مسجد بھی بنائی۔ ایسا کم ہی دیکھنے میں آتا ہے اور یہی ایک دلچسپ بات تھی جس نے مجھے بے حد متاثر کیا۔ میں نے اس مسجد کی کچھ تصاویر دیکھیں جو یہ بتا رہی تھیں کہ وہ بہت ہی خوبصورت مسجد ہے۔ یہ بھی یاد رہے کہ ریاست کپور تھلہ میں ساٹھ فیصد سے زائد مسلمان رہتے تھے اور اس وقت کپور تھلہ میں مسلمان آبادی کا صرف دو فیصد ہیں۔

راجا نے اس مسجد پر اتنا زیادہ خرچ کیا کہ وائسرائے ہند نے اس سے متعلق پوچھا کہ آپ نے ایک عمارت پر اتنا خرچ کیوں کیا؟ اس کے جواب میں راجا نے کہا کہ میری

ریاست کی ساٹھ فیصد آبادی مسلمانوں پر مشتمل ہے اسی لیے میں یہ چاہتا ہوں کہ ان کے لیے ایک بڑی مسجد بنائی جائے۔ اس مسجد کا ڈیزائن بھی ایک فرانسیسی آرکیٹیکٹ سے بنوایا گیا۔ میں نے اس بات کا ذکر اپنے ایک عزیز دوست فاروق بھٹی صاحب سے کیا تو انھوں نے مجھے بتایا کہ ان کے کچھ رشتہ دار کپور تھلہ میں رہتے تھے اور کپور تھلہ کی مسجد کا ماڈل بھی ان کے گھر موجود تھے۔ جس سے یہ اندازہ ہوتا تھا کہ مسجد انتہائی کشادہ اور خوبصورت ہے۔

تاریخ پڑھتے ہوئے اسی بے شمار دلچسپ باتیں دیکھنے کو ملتی ہیں جن کا ہمیں اندازہ بھی نہیں ہوتا۔ اس مسجد کا افتتاح 1930ء میں نواب صادق خان، نواب آف بہاولپور نے کیا تھا۔

کیا خوبصورت بات ہے کہ ایک سکھ راجا نے اپنی ریاست میں بسنے والے مسلمانوں کے لیے مسجد بنوائی لیکن خود اس کا افتتاح کرنے کی بجائے قریبی ریاست بہاولپور کے مسلمان نواب کو بلا کر اس سے افتتاح کروایا۔

مسجد کی تصاویر دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ یہ مسجد سپین میں واقع مسجد قرطبہ کی طرز پر بنائی گئی ہے. شاید اسی وجہ سے اس کا نام مورس مسجد رکھا گیا۔اس کی تزئین و آرائش میو سکول آف آرٹس لاہور کے لوگوں نے کی۔اس کے اندر لکڑی کا بھی بہت زیادہ کام ہوا ہے۔ مسلمانوں کی تعداد نہ ہونے کی وجہ سے دیہات میں موجود مساجد تو بالکل ختم ہو گئیں ہیں جبکہ شہر کی یہ بڑی مسجد بھی زبوں حالی کا شکار ہے۔ اگر وہاں مسلمان رہتے تو یقیناً اس مسجد کی شان و شوکت میں بھی اضافہ ہوتا۔

Moorish Mosque, Kapurthala
Photo Credit: https://en.wikipedia.org

Plaque at Moorish Mosque
Photo Credithttps://en.wikipedia.org/wiki:

اس ریاست کی تاریخ پڑھنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ عوام کی فلاح و بہبود کے لیے جس قدر کام مہاراجا جگجیت سنگھ نے کیے ہیں، شاید ہی کسی اور نے کیے ہوں۔

میرے علم کے مطابق یہ ریاست وہ واحد ریاست تھی جس نے بطور ریاست تقسیم ہند کی مخالفت کی تھی لیکن ان کی مخالفت سے تقسیم ہند تو نہ رُک سکی البتہ کپور تھلہ مسلمانوں سے خالی ہو گیا۔

جب میں نے یہ جاننے کی کوشش کی کہ اس شہر کا نام کپور تھلہ کیوں ہے تو اس کی ایک دلچسپ وجہ معلوم ہوئی۔

سکھوں کی تاریخ میں عالمگیر کے دور سے تقسیم ہند تک تقریباً ساڑھے تین سو سال کا ایک ایسا دور ہے جب سکھ حالت جنگ میں رہے، کبھی جیتے اور کبھی ہارے۔ وہ ایک مذہبی گروہ سے بڑھ کر ایک بہت بڑی سیاسی طاقت بنے اس دوران ان کی بہت سی ریاستیں بھی قائم ہوئیں اور پنجاب میں ان کو بارہا شکست بھی ہوئی۔ کپور سنگھ سن 1697ء میں شیخوپورہ پاکستان، کے قریب ایک گاؤں میں پیدا ہوا، جس کے نام پر کپور تھلہ شہر بسا۔ وہ خالصہ دل کا بانی بھی تھا۔ کپور سنگھ ان جن لوگوں میں سے ہے جنہیں سکھوں کے ہاں بہت زیادہ عزت دی جاتی ہے۔

کہتے ہیں کہ اس کے والد نے پہلی مرتبہ سکھوں کی فوج بنائی جس نے لاہور کے مغل گورنر ذکریا خان بہادر کے خلاف جنگ لڑی۔ یہ بھی دیکھنے کو ملتا ہے ذکریا خان نے پہلی مرتبہ سکھوں کی گرفتاری، زندہ یا مردہ، پر ایک بہت بڑا انعام رکھا۔ جس کے خوف سے تمام سکھ پنجاب کے مختلف جنگلوں میں چھوٹی چھوٹی ٹولیاں بنا کر رہنے لگے لیکن جب یہ طریقہ بھی کامیاب نہ ہوا تو مغلیہ حکمرانوں نے ذکریا خان کو اس کام سے منع کر دیا اور

اس وقت کے سکھوں کے سردار کپور سنگھ کو نواب کا خطاب دے دیا۔ عام طور پر نواب کا خطاب مسلمانوں کے لیے استعمال ہوتا تھا، پہلی مرتبہ یہ خطاب کپور سنگھ اور اس کے بڑوں کو دیا گیا۔

بہرحال یہ ایک مختلف کہانی ہے کہ کس طرح سکھوں اور مغلیہ سلطنت کے درمیان سترہویں صدی کے آغاز سے انیسویں صدی کے نصف تک ،دو سو سال تک جنگ جاری رہی اور پھر سکھوں کی یہ جنگ انگریزوں کے ساتھ اگلے نوے سال بھی جاری رہی۔

تقسیم ہند ہو گئی، بھارت معرض وجود میں آگیا اور اس وقت سے اب تک سکھ، دہلی حکومت کے خلاف مسلسل جدوجہد میں زندگی گزار رہے ہیں۔ اس دوران ان پر بے شمار برے وقت بھی آئے ، پنجاب کی تقسیم بھی ہوئی اور گولڈن ٹیمپل کا واقعہ بھی پیش آیا۔ مجھے تو یوں لگتا ہے جیسے پچھلے چار سو سال سے سکھ حالتِ جنگ میں ہیں۔

اب خالصتان کی تحریک چل رہی ہے اور اس میں بیشمار لوگوں گرفتار اور قتل بھی کیا جا رہا ہے۔ کچھ سکھ حکومت کے ساتھ ہیں اور کچھ مخالف۔

سلسلہ چلے جا رہا ہے۔۔۔

شاید سکھوں کے ڈی این اے میں آزاد زندگی گزارنے کے جراثیم زیادہ ہی پائے جاتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ وہ کبھی بھی کسی کی غلامی قبول نہیں کرتے۔ ہندوستان میں جب تک سکھوں میں طاقت رہی وہ مغلیہ سلطنت اور انگریزوں کے خلاف بر سرِ پیکار رہے۔ جب تک سکھ میدان میں رہے تب تک انگریزوں کی ہندوستان پر حکمرانی ادھوری ہی رہی۔ پھر اس کے بعد چیلیاں والا، گجرات کی لڑائی میں سکھوں کی شکست کے بعد انگریزوں کو ہندوستان بھر میں کوئی للکارنے والا نہیں تھا۔ یہ بات بھی اہم ہے کہ پشتون قبائل نے بھی مالاکنڈ کی جنگ لڑ کر یہ ثابت کیا کہ ہندوستان پر غیر ملکی تسلط نا قابلِ

قبول ہے۔ پشتونوں کی شکست تاریخ کا وہ المیہ ہے جسے بھلانا آسان نہیں ہے۔اس کے بعد کوئی نہ تھا جو میدان جنگ میں انگریزوں کو للکارتا۔۔۔ البتہ اس کے بعد جنگِ آزادی سیاسی محاز پر لڑی جانے لگی۔اس کے ساتھ ساتھ کچھ لوگ ایک گوریلا جنگ بھی کرتے رہے جیسے بھگت سنگھ ،اس کے ساتھی اور غدر پارٹی وغیرہ۔ کچھ لوگ فوج بنا کر بھی لڑے جیسے نیتا سبھاش چندر۔۔۔

مقصد سب کا آزادی ہی تھا۔۔۔ جو آخر کار مل ہی گئی۔۔۔آزادی کے بعد جو خون خرابہ ہوا۔۔۔ وہ تو کسی کو بھی مطلوب نہیں تھا۔۔۔ وہ تو کسی اور کا ہی ایجنڈا تھا۔۔۔

سلطان پور لودھی: جہاں سکھ مذہب کا آغاز ہوا

میں نے نقشے میں دیکھا کہ کپورتھلہ سے جنوب مغرب کی جانب سلطان پور لودھی نام کا ایک شہر موجود ہے۔ میں نے اس سے پہلے سکھوں کی تاریخ پڑھتے ہوئے یہ جانا تھا کہ گورو نانک صاحب ننکانہ میں پیدا ہوئے اور بعد میں سلطان پور لودھی چلے گئے جو جالندھر سے پچاس کلومیٹر کے فاصلے پر جنوب مغرب میں واقع ہے۔ سکھوں کے مطابق بابا گرو نانک صاحب نے چودہ سال سے زائد عرصہ اس شہر میں گزارا۔ اس وجہ سے یہ شہر سکھوں کے نزدیک بہت ہی متبرک مانا جاتا ہے۔

ہم اس سے تقریبا پچاس کلومیٹر کے فاصلے سے گزر رہے تھے، ہم اسے دیکھ تو نہ سکے لیکن بہت سے سکھوں کے ساتھ بات چیت کرنے سے علم ہوا کہ یہ شہر ننکانہ صاحب کے بعد ان کے لیے نہایت ہی مقدس ہے۔

اس شہر کا ایک مختصر احوال آپ کی خدمت میں پیش ہے۔

تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ اس جگہ پر دو ہزار سال پہلے بھی ایک شہر جس کا نام سروانپورا تھا، آباد تھا، جو اس وقت بدھ مت کا بہت بڑا مرکز تھا۔جب ہندو دھرم کا آغاز ہوا تو ہندو بھی یہاں آکر بسنے لگے۔ تاریخی کتب میں بھی تحریر ہے کہ بدھ مت کی بہت سی کتابیں اسی شہر میں لکھی گئیں۔

گیارہویں صدی کے آغاز میں جب محمود غزنوی نے ہندوستان پر حملہ کیا تو اس نے اس شہر پر بھی حملہ کیااور اسکی تباہی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ ہندوؤں کی کتابوں میں بھی اس شہر کا ذکر تفصیل سے ملتا ہے۔ محکمہ آثارِ قدیمہ کے سروے سے بھی یہ تصدیق ہوتی ہے کہ اس جگہ پر کبھی ایک بڑا شہر بھی آباد تھا۔

تاریخ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ لاہور سے دہلی کا ایک راستہ سلطان پور لودھی کے قریب سے بھی ہو کر جاتا ہے۔ اگر آپ نقشے میں دیکھیں تو یہ جان سکیں گے کہ یہ راستہ جی ٹی روڈ سے نسبتاً کم طویل ہے۔ ایک اور بات بھی اہم ہے کہ ہندوستان کے مغربی علاقوں میں ،خاص طور پر راجستھان اور گجرات جانے کے لیے بھی یہی راستہ موزوں تھا۔ اسی وجہ سے سلطان پور لودھی ایک بڑی تجارتی منڈی کی حیثیت بھی رکھتا تھا۔ سلطان پور لودھی دریائے ستلج کے مشرق میں واقع ہے اس کے قریب ہی ایک بڑا برساتی نالہ بھی بہتا ہے جسے کالی بھین کہتے ہیں۔

بارہویں صدی میں جب دہلی پر نصیرالدین محمد شاہ کی حکومت تھی تو اس نے اپنے ایک رشتے دار نواب ولی محمد خان لودھی کو پنجاب کا گورنر بنایا. اس کا ایک بیٹا سلطان اس راستے سے گزر رہا تھا تو اسے یہاں کی خوبصورتی بہت پسند آئی اور اس نے علاقے سے متعلق مزید دریافت کیا تو اسے پتہ چلا کہ یہاں پر کبھی ایک بڑا شہر بھی آباد تھا جسے غزنوی کی فوجوں نے جلا کر راکھ کر دیا تھا۔ یہ سب جان کر اس نے اسی مقام پر ایک نیا شہر بسانے کا فیصلہ کیااور اس کا نام سلطان پور لودھی رکھا گیا۔

جیسا کہ میں نے پچھلی سطور میں ذکر کیا ہے کہ یہ اس وقت لاہور اور دہلی کے درمیان میں ایک معروف گزرگاہ بھی تھی جس کی وجہ سے بہت سے تجارتی قافلے انھی علاقوں سے ہو کر گزرتے تھے، اس سب کو مد نظر رکھ کر سلطان نے یہاں پر ایک بہت بڑی مارکیٹ بھی بنوائی۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ یہاں پر چھ ہزار کے قریب دکانیں تھیں۔اس کا کوئی ثبوت تو نہیں ہے لیکن عام طور پر یہی بات کہی جاتی ہے۔

آئین اکبری میں بھی اس شہر کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس بات کا بھی ذکر ہے کہ یہاں پر کئی شاہی عمارتیں موجود تھیں جن میں بہت سے باغات بھی تھے۔ یہ بات جان کر مجھے بھی حیرانی ہوئی کہ یہ شہر دینی مدارس کے لیے بھی بہت مشہور تھا اور بہت سے مسلمان یہاں پر آباد تھے۔ ان مدارس کی تفصیل تو نہیں ملتی البتہ یہ ضرور پتہ چلتا ہے کہ شاہجہان کے بیٹے اورنگزیب اور داراشکوہ نے اپنی ابتدائی دینی تعلیم اسی شہر میں واقع ایک مدرسے سے حاصل کی تھی۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اس شہر کو پیراں پور، یعنی پیروں کا شہر بھی کہا جاتا تھا۔

اس شہر میں کچھ تو ایسی بات ہو گی جس کی وجہ سے مغل حکمران اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت کے لیے انھیں یہاں بھیجتے تھے۔

سلطان پور کی دوسری اہم بات بابا گرو نانک صاحب سے جڑی ہوئی ہے۔

بابا گرو نانک صاحب 1469ء میں ننکانہ صاحب کے قریب ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ ان کی زندگی کے بارے میں بہت کچھ لکھا گیا ہے لیکن یہاں میں جس بات کا تذکرہ کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ انھوں نے تقریباً 14 سال سے زائد کا عرصہ اس شہر میں گزارا اور یہیں سے اپنے دھرم کا آغاز بھی کیا، جس کا ایک مختصر احوال آپ کی خدمت پیش ہے۔

جب بابا گورو نانک صاحب کی پیدائش ہوئی تو اس وقت دہلی کے تخت پر لودھی خاندان براجمان تھا۔ جب بابر نے پانی پت میں لودھی کو شکست دی تو اس وقت بابا گورو نانک صاحب کی عمر 57 سال تھی۔ وہ مغلیہ سلطنت کے قیام کے 13 سال بعد وفات پا گئے۔ تاریخ میں کچھ لوگوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ سکھوں نے ان کی زندگی میں ہی بابر کو جابر کہنا شروع کر دیا تھا۔ یہ ایک الگ داستان ہے جس کا ذکر یہاں مناسب نہیں۔

بابا گرو نانک کی بہن بی بی نانکی جی کی شادی سلطان پور میں ہوئی۔ سکھ روایت کے مطابق بابا جی کسی وجہ سے اپنی بہن کے پاس اس شہر میں آ گئے۔ انھوں نے یہاں پر ایک مسلمان راجا کی ملازمت بھی کی۔ سکھوں کی کتابوں میں یہ بھی لکھا ہے کہ راجا کو کوئی بہت ہی ایماندار آدمی چاہیے تھا جس پر گورو نانک بالکل پورے اترتے تھے۔ کچھ لوگوں نے ان کی شکایت بھی کی جس پر راجا نے انھیں تین دن کے لیے ایک کوٹھڑی میں بند کر دیا۔ وہ کوٹھڑی اب بھی موجود ہے اور سکھ بڑی تعداد میں اس کے درشن کے لیے آتے ہیں۔

سکھوں کی کتابوں میں یہ بھی لکھا ہے کہ یہیں پر بابا گرو نانک صاحب نے اپنی تعلیمات کا آغاز کیا اور اپنے مذہب کی اشاعت کے لیے ایک عمارت بھی بنوائی۔ میرا خیال ہے کہ گردوارہ کے لفظ کا آغاز بھی یہیں سے ہوا ہو گا کیونکہ لفظ گردوارہ کا مطلب ہے گورو کا دوارہ۔

Baba Guru Nank Ji at Sultan Pur Lodhi
Photo Credit: http://wikimapia.org

دوارہ کا مطلب دروازہ نہیں بلکہ کسی حد تک یہ دربار کا مطلب یا آنگن ادا کرتا ہے۔ پنجابی سے تعلق رکھنے والے لوگ دروازے اور دوارے میں فرق جان سکتے ہیں۔ دروازہ صرف اسے کہتے ہیں جہاں سے گزرا جا سکے جبکہ دوارہ اسے کہتے ہیں جو گھر کا پہلا حصہ ہوتا ہے جہاں مہمانوں کے بیٹھنے کا انتظام ہوتا ہے۔ جتنے بھی گردوارے ہیں ان کا مطلب بھی یہی ہے گورو کا دوارہ، دروازہ نہیں، جہاں ہر کسی کو جانے کی اجازت ہے۔ اس لیے کسی بھی گردوارے میں کسی کو بھی جانے، بیٹھنے اور کھانا کھانے سے منع نہیں کیا جاتا۔

ہر گردوارے میں تین چیزیں لازم ہوتی ہیں۔ ایک دربار صاحب جہاں پر گرنتھ صاحب کو ایک اونچے تخت پر رکھا جاتا ہے اور لوگ اس کے ارد گرد بیٹھ کر مختلف گیت گاتے ہیں۔اس کے ساتھ ساتھ ایک لنگر خانہ، جہاں پر سب لوگوں کے لیے کھانے کا بندوبست ہوتا ہے۔ ہر گردوارے پر ایک جھنڈا بھی لگا ہوتا ہے جسے نشان صاحب کہا جاتا ہے۔

نادر شاہ نے بھی اس شہر کو تباہ کیا اور جو تباہی مچائی جا سکتی تھی وہ اس نے مچائی۔ بعد ازاں سردار جسا سنگھ آہلووالیا نے اس شہر کو دوبارہ سے بسایا اور کپورتھلہ ریاست کی بنیاد رکھی۔ جنگوں اور علاقے میں افراتفری کی وجہ سے لاہور اور دہلی کا یہ راستہ غیر محفوظ ہو گیا اور موجودہ جی ٹی روڈ کو لاہور سے دہلی جانے کے لیے استعمال کیا جانے لگا۔

اس شہر پر ایک فلم بھی بنائی گئی ہے جس کا نام ،داستان سلطان پور لودھی ہے۔ سلطان پور لودھی اب بھی ایک چھوٹا سا قصبہ ہے جس کی آبادی بیس ہزار سے زائد نہیں ہے۔ تحصیل سلطان پور کی آبادی تقریبا سوا لاکھ کے قریب ہے جس میں تین تہائی لوگ سکھ ہیں۔ پچیس فیصد کے قریب ہندو جبکہ مسلمانوں کی تعداد نصف فیصد بھی نہیں ہے. اس لیے یہاں پر موجود مسلمانوں کی حالت بھی ابتر ہے۔

یہ شہر جو کبھی پیروں کا علاقہ تھا اور دہلی کے بادشاہ اپنے بچوں کو تعلیم و تربیت کیلیے یہاں بھیجتے تھے، تقسیم ہند کے بعد یہاں کوئی بھی مسلمان نہیں رہتا۔ سب یا تو مار دیے گئے یا پاکستان ہجرت کر گئے۔ البتہ نام ابھی تک باقی ہے۔ جسے بدلنے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی۔

ہجرت کی راہ کس نے کیسے عبور کی؟ یہ سب اب تاریخ کا ایک اہم حصہ ہے!

سعود عثمانی، مولانا مفتی شفیع عثمانی کے پوتے سے بہتر ہجرت کا ذکر کسی نے نہیں کیا۔۔۔ یہ نظم مجھے محترم بھائی راؤ محمد ظفر صاحب نے بھیجی تھی۔

ہچکیوں نے کسی دیوار میں در رکھا تھا

میرے آباء نے جب اِس خاک پہ سر رکھا تھا

گھر سے نکلے تھے تو اِک دشتِ فنا کی صورت

راہ میں صرف سفر، صرف سفر رکھا تھا

دل تھے متروکہ مکانات کی صورت خالی

اور اسباب میں بچھڑا ہوا گھر رکھا تھا

جسم اجداد کی قبروں سے نکلتے ہی نہ تھے

نسل در نسل اِسی خاک میں سر رکھا تھا

روح پر نقش تھے وہ نقش ابھی تک جن میں

رنگ بچپن کی کسی یاد نے بھر رکھا تھا

دل میں سر سبز تھے اُس پیڑ کے پتے جس پر

دستِ قدرت نے ابھی پہلا ثمر رکھا تھا

کٹتے دیکھے تھے وہ برگد بھی، جنھوں نے خود کو

مدتوں دھوپ کی بستی میں شجر رکھا تھا

جلتے دیکھے تھے وہ خود سوز محلّے جن میں

جانے کب سے کوئی خوابیدہ شرر رکھا تھا

چوڑیاں ٹوٹ کے بکھری تھیں ہر اک آنگن میں

اک کنواں تھا کہ تمنّاؤں سے بھر رکھا تھا

راہ تھی سرخ گلابوں کے لہو سے روشن

پاؤں رکھا نہیں جاتا تھا، مگر رکھا تھا

قافلے ایک ہی سرحد کی طرف جاتے تھے

خواب کے پار کوئی خوابِ دگر رکھا تھا

تیرگی چیر کے آتے ہوئے رستوں کے لیے

ایک مہتاب سرِ راہ گزر رکھا تھا

اک حسیں چاند تھا اک سبز زمیں پر روشن

اک ستارے کو بھی آغوش میں بھر رکھا تھا

حرفِ اظہار میں حائل تھیں فصیلیں لیکن

رکھنے والے نے خموشی میں اثر رکھا تھا

چشمِ بینا میں وہ منظر ابھی تازہ ہے جناب

میرے آباء نے جب اس خاک پہ سر رکھا تھا

جالندھر: صدیوں پرانا ایک شہر

میں نے اپنے پاس موجود نقشے میں دیکھا کہ جی ٹی روڈ پر ہمارے راستے میں جالندھر شہر ہے اور ہم اس کے پاس سے بھی گزریں گے۔ جالندھر کا ذکر آتے ہی بہت سے نام ذہن میں آجاتے ہیں جن میں سے کچھ کا تعلق فلم انڈسٹری سے کچھ کا ادب سے اور کچھ کا سیاست سے ہے۔ سب سے پہلا نام میرے ذہن میں وہ حفیظ جالندھری صاحب کا آیا تھا۔ جو پاکستان کے قومی ترانے کے خالق ہیں۔ انھوں نے اس کے علاوہ بھی بہت ساری شاعری کی ہے لیکن ان کی وجہ شہرت قومی ترانہ ہی ہے۔

میرا تعلق ٹوبہ ٹیک سنگھ سے ہے اور میں ایک طویل عرصہ فیصل آباد میں رہا ہوں۔ فیصل آباد میں ان لوگوں کی ایک کثیر تعداد آباد ہے جو تقسیم ہند سے پہلے اور تقسیم ہند کے بعد جالندھر سے پاکستان آئے تھے۔ میرا خیال ہے کہ اگر پاکستان میں لوگوں سے بھارتی شہروں کے نام پوچھے جائیں تو جالندھر ان چند ناموں میں سے ہوگا جنھیں لوگ زیادہ جانتے ہوں گے۔

ابھی سرہند کافی دور تھا، بچے تھکاوٹ بھی محسوس کر رہے تھے اور بھوک لگنا بھی ایک فطری سی بات تھی۔ ارد گرد ایک میدانی علاقہ تھا۔ بڑی تعداد میں لوگ کھیتوں میں چاول کاشت کرنے کی تیاری کر رہے تھے۔

نقشے سے پتہ چلا کہ ہمارے بائیں طرف ہشیار پور ہے۔ اگر آپ نقشہ دیکھیں تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ اس شہر سے بہت سی سڑکیں دوسرے شہروں کو بھی نکلتی ہیں۔ اس سے پہلے کہ میں آپ کو ہشیار پور کے بارے میں کچھ بتاؤں میں چاہوں گا کہ جالندھر کا ایک مختصر تعارف آپ کی خدمت میں پیش کیا جائے۔

جالندھر کے نام سے متعلق کئی باتیں مشہور ہیں۔ ایک بات جس پر بہت سے لوگوں کا اتفاق ہے، کے مطابق زمانہ قدیم میں جالندھر نام کا ایک بادشاہ یہاں حکمرانی کرتا تھا جس کا ذکر مہابھارت میں بھی ہے۔ اسی کے نام پر اس شہر کا نام رکھا گیا۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ دو دریاؤں کے درمیانی علاقے کو بھی جالندھر کہتے ہیں اور اسی لیے اس شہر کا نام جالندھر ہے۔ قدیم زمانوں میں جالندھر کی بادشاہی راوی اور ستلج کے درمیان تمام علاقوں تک پھیلی ہوئی تھی۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ راما کے بیٹے لاوا کی حکومت کا صدر مقام بھی یہی شہر تھا۔

اس شہر کی تاریخ پڑھتے ہوئے یہ بات بھی جاننے کو ملتی ہے کہ وادی سندھ کی تہذیب، جہاں وہ ایک طرف مہرگڑھ بلوچستان سے جڑی ہوئی ہے اور جنوب میں اس کی سرحدیں چنائی تک پھیلی ہوئی ہیں کے اثرات شمالی ہندوستان میں بھی پائے جاتے ہیں۔ جالندھر میں کئی جگہوں پر وادی سندھ کی تہذیب کے نشانات بھی ملتے ہیں۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے یہ علاقہ قدیم عرصے سے آباد چلا آرہا ہے۔

یہ سب جان کر مجھے اس بات کا یقین ہو گیا کہ وادی سندھ کی تہذیب ایک بہت بڑے علاقے پر پھیلی ہوئی تھی اور اپنے زمانے کی بہت ہی ترقی یافتہ تہذیب تھی لیکن اس تہذیب اور بعد میں آنے والے لوگوں کے درمیان کئی ہزار سال کا ایک زمانہ ہے جس سے یہ جاننے میں دقت پیش آرہی ہے کہ وہ لوگ کون تھے کیسے ساتھ براہ راست رابطے کی کوئی شکل نظر نہیں آرہی۔

تیرہویں صدی کے آخر میں علاؤالدین خلجی نے اس علاقے کو فتح کیا۔ اس کے بعد لاہور اور دہلی کے راستے پر ہونے کی وجہ سے جو بھی فاتح ہندوستان آیا اس نے جالندھر کی خبر ضرور لی۔ جالندھر کی تاریخ پڑھتے ہوئے بھی سلاطین دہلی کے دور کی بے شمار لڑائیوں کا ذکر ملتا ہے۔ بعد ازاں مغل بھی اس پر قابض ہوئے۔ شاہ جہاں نے حسب معمول یہاں سرائے بنائی اور کئی دیہات کی بنیاد بھی رکھی۔ جن میں ایک علاقہ پھلور بھی ہے۔ سکھوں اور مغلیہ سلطنت کے درمیان بہت سی لڑائیاں بھی اسی علاقے میں لڑی گئیں۔ بابا بندہ سنگھ بہادر بھی اس علاقے کا ایک مشہور جرنیل تھا۔ نادر شاہ نے بھی اس شہر کو تباہ کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ لڑائیوں کی ایک طویل فہرست ہے۔ جن کا ذکر تاریخ کی کتابوں میں تفصیل سے ملتا ہے۔

اس شہر کے آخری غیر ملکی حکمران انگریز تھے جنھوں نے 1846ء میں سکھوں کو شکست دے کر اس پر قبضہ کیا اور جان لارنس اس علاقے کا پہلا انگریز کمشنر مقرر ہوا۔ اسی دور میں انگریزوں نے اس جگہ پر ایک چھاؤنی بھی تعمیر کی۔ جنگ آزادی میں بھی اس چھاؤنی میں موجود فوج نے مجاہدین آزادی کو کچلنے میں ایک اہم کرادر ادا کیا۔ غدر پارٹی کے بھی بہت سے لوگوں کا تعلق اسی شہر سے تھا۔ تحریک خلافت چلانے میں بھی یہ شہر پیش پیش تھا۔ تقسیم ہند کے وقت سب سے زیادہ نقصان بھی اس علاقے میں بسنے والے مسلمانوں کا ہوا۔ مسلمان یہاں ایک کثیر تعداد میں آباد تھے اور ارد گرد سکھوں کی آبادیاں تھیں جنھوں نے ناقابلِ بیان ظلم کیے۔

ہم جب جالندھر سے گزر رہے تھے تو مجھے یاد آیا کہ تاریخ کی کتابوں میں لکھا ہے کہ تقسیم ہند کے وقت اس شہر میں پچاس فیصد مسلمان پچیس فیصد ہندو پچیس فیصد سکھ تھے۔ آج شہر میں ہندوؤں کی تعداد ستر فیصد سے زائد اور سکھ پچیس فیصد ہیں جو یہاں کی ثقافت، تہذیب و تمدن میں ایک اہم مقام رکھتے تھے ان کی تعداد ایک فیصد کے قریب

ہے۔ یہ تعداد نہ ہونے کے برابر ہے۔ آپ یوں کہہ سکتے ہیں کہ اب اس شہر میں کوئی بھی مسلمان آباد نہیں ہے۔

جالندھر جو تیرہویں صدی سے مسلمانوں کی ملکیت میں چلا آرہا تھااور مسلمانوں نے یہاں پر اپنی تہذیب و تمدن کی بے شمار نشانیاں بھی چھوڑی تھیں ، جو مساجد اور سرائے کی شکل میں آج بھی شہر میں موجود ہیں، لیکن انھیں بنانے والے یہاں نہیں ہیں۔

پاکستان کے کئی مشہور لوگوں کا تعلق بھی اسی شہر سے ہے جن میں جنرل ضیاء الحق کا نام بھی آتا ہے۔اس کے علاوہ اندر کمار گجرال سابق وزیرِاعظم بھارت، جناب فتح علی خان، چوہدری محمد علی، پاکستان کے سابق وزیرِاعظم اور وسیم سجاد، سابق صدر پاکستان کا تعلق بھی اسی شہر سے ہے.

عمران خان کی والدہ کی پیدائش بھی جالندھر کے قریب ایک قصبے، بستی دانش منداں میں ہوئی تھی اور ددھیال کا تعلق بھی اسی علاقے سے تھا۔اس شہر نے بہت سے حکمران نامور کھلاڑی، مشہور ادیب اور فلم انڈسٹری کے قابلِ ذکر اداکار بھی پیدا کیے ہیں.اب تک میں نے جتنے بھی شہروں سے تعلق رکھنے والے اہم لوگوں کی تاریخ پڑھی ہے ان میں اتنی بڑی تعداد میں اتنے اہم لوگوں کا کسی ایک شہر سے تعلق ہونا ایک منفرد بات ہے۔

آج ہم اس شہر کے پاس سے گزر رہے تھے اور اس بات کا افسوس تھا کہ ہم شہر کو قریب سے نہ دیکھ سکے۔ زندگی رہی اور حالات نارمل ہوئے تو انشاءاللہ ضرور۔اس جالندھر کو قریب سے دیکھوں گا جہاں سے تعلق رکھنے والے حفیظ جالندھری نے پاکستان کا قومی ترانہ لکھا تھا جسے ہم بڑے ادب سے کھڑے ہو کر پڑھتے ہیں۔

یہاں پر ہمارا پڑاؤ نہیں تھا اس لیے ہم اسے دور سے دیکھتے ہوئے آگے لدھیانہ کی طرف چلے گئے۔ اس سے پہلے کہ میں آپ کو لدھیانہ کی تاریخ سے آگاہ کروں، میں اپنے بائیں طرف موجود ایک بہت ہی مشہور شہر ہشیار پور کا ذکر کرنا چاہوں گا۔

ہشیار پور: ہشیار خان کے نام کا ایک صدیوں پرانا قصبہ

ہم جالندھر شہر سے جیسے ہی باہر نکلے تو میں نے دیکھا کہ ہمارے بائیں طرف ایک سڑک ہشیار پور کی طرف جا رہی تھی۔ میرے لیے ہمیشہ ہی ہشیار پور کا نام ایک کشش رکھتا تھا۔ اس کی کئی وجوہات ہو سکتی ہیں، ایک یہ بھی تھی کہ ہمارے ٹوبہ ٹیک سنگھ میں بھی کافی لوگوں کا تعلق ہشیار پور سے ہے۔ کچھ کتابوں میں اسے ہوشیار پور بھی لکھا جاتا ہے۔ میرے نزدیک، صحیح ہشیار پور ہے۔ پاکستان کی سرکاری اردو لغت میں بھی ہشیار ہی لکھا گیا ہے۔

مجھے یاد ہے کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ میں ہشیار پور نام سے ایک فرنیچر کی دکان بھی تھی۔ عام طور پر لوگ یہ کہتے تھے کہ ہشیار پور کے لوگ بہت ہشیار ہوتے ہیں۔ ہشیار ہونے کا مطلب یہ ہے کہ یہاں کے لوگ بہت چالاک ہوتے ہیں۔ ہشیار ہونا کوئی بری بات نہیں لیکن عام طور پر یہ لفظ منفی معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔ اب ایسا کچھ نہیں ہے، اب سب ہی ہشیار ہو گئے ہیں۔

اگر آپ نقشے میں ہشیار پور کو دیکھیں تو آپ جان پائیں گے کہ ہشیار پور، جالندھر سے چالیس کلومیٹر کے فاصلے پر شمال مشرق کی طرف پہاڑی علاقے کے قریب واقع ہے۔ اس کی شمالی سرحد ہماچل پردیش سے ملتی ہے اور یہ سطح سمندر سے تقریباً ایک ہزار فٹ بلند ہے۔ اس کے مقابلے میں لاہور سطح سمندر سے چھ سو فٹ بلندی پر واقع ہے۔ اسی وجہ سے اس شہر کے آس پاس کئی پہاڑیاں بھی پائی جاتی ہیں اور یہاں سبزہ بھی کافی زیادہ ہے۔ یہاں کا موسم نسبتاً معتدل ہے۔ آپ اس کا موازنہ ہمارے سیالکوٹ یا میرپور سے کر

سکتے ہیں جو پہاڑی علاقوں کے قریب ہیں اور اس وجہ سے وہاں موسم اتنا گرم نہیں ہوتا۔ یہاں پر کئی مشہور جگہیں ہیں جن میں قابل ذکر شیش محل اور وائلڈ لائف پارک کے علاوہ کئی گردوارے اور مندر بھی ہیں۔ معتدل موسم ہونے کی وجہ سے اس علاقے میں پھل اور سبزیوں کی کثرت ہوتی ہے اور یہ اسکی وجہ شہرت بھی ہے۔

تاریخ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اس شہر میں بہت سے ہندوؤں کے گورو بھی آئے جس کی وجہ سے اسے سنتوں کا شہر بھی کہا جاتا ہے۔ تاریخ ہمیں یہ بھی بتاتی ہے کہ یہ علاقہ زمانہ قدیم میں وادی سندھ کی تہذیب کا حصہ بھی رہا ہے۔ یہاں پر اس دور کی بے شمار چیزیں بھی ملتی ہیں۔ جس سے میرے اس تاثر کی تائید ہوتی ہے کہ شمالی ہندوستان کا ایک بڑا علاقہ وادی سندھ کی تہذیب کا حصہ رہا ہے۔

ہشیارپور کی تاریخ جانتے ہوئے مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ اس شہر میں پانڈوؤں کے دور کی عمارتیں بھی ملتی ہیں۔ مشہور چینی سیاح ہیون سنگ نے بھی اس شہر کا ذکر کیا ہے۔ مسلمانوں کی آمد سے قبل یہاں پر چندر بنسی راجپوت خاندان کی حکمرانی تھی وہ لوگ ایک طویل مدت تک افغانوں کے ہندوستان پر حملوں کا مقابلہ کرتے رہے اور بلاآخر شکست ان کا مقدر بنی۔

میں نے کئی جگہ پر یہ بھی پڑھا کہ محمود غزنوی دسویں صدی کے آخر اور گیارہویں صدی کے شروع میں کئی بار ہندوستان آیا لیکن کوئی حکومت قائم نہ کرسکا اور واپس چلا گیا، البتہ اس نے لاہور میں اپنا ایک گورنر ضرور مقرر کیا تھا۔ اس کے بعد بارہویں صدی کے آخر میں غوری نے یہاں پر حملہ کیا اور اپنی ریاست قائم کی۔ ان دو سو سالوں میں کئی لوگ افغانستان سے پنجاب تک آتے رہے لیکن وہ دہلی تک نہیں پہنچے اور پنجاب تک ہی محدود رہے۔ انھی ناموں میں سے ، ابراہیم نامی شخص بھی شامل ہے، جس کا ذکر شاعر لال مان بھی نے کیا ہے ۔ لال مان کے یہ شخص اس علاقے میں

گیارہویں صدی کے وسط سے آخر تک تقریباً چالیس سال تک حکمرانی کرتا رہا ہے۔ یہ تمام تر معلومات ہشیار پور ضلع کی سرکاری ویب سائٹ پر بھی موجود ہیں۔ اس دور میں بھی پہاڑی علاقے بدستور ہندو راجاؤں کے زیرِ تحت ہی رہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ ہماچل پردیش اور دیگر پہاڑی علاقوں میں مسلمان میدانی علاقوں کی نسبت کم ہے۔

انگریزوں نے سکھوں کے ساتھ کئی جنگیں کیں لیکن 1846ء کی جنگ میں اس علاقے کی قسمت کا فیصلہ ہوا اور یہ علاقہ بہت سے دیگر علاقوں سمیت انگریزوں کے ماتحت ہو گیا۔

ہشیار پور میں کئی جگہ پر کھدائی کی گئی۔ شوالک پہاڑی کے پاس کھدائی کے دوران ایسی چیزیں بھی ملتی ہیں جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ پتھر کے زمانے سے یہاں پر لوگ آباد تھے۔اس علاقے میں موجود رحمانپورہ نامی قصبے سے بہت زیادہ ایسی چیزیں ملی ہیں۔ ان سب باتوں سے اس خیال کی تصدیق ہوتی ہے کہ وادی سندھ کی تہذیب کے اثرات بہت دور تک پھیلے ہوئے ہیں۔ مہابھارت میں بھی اس شہر کا ذکر ملتا ہے۔

اس علاقے میں ایک دسوا نامی گاؤں بھی موجود ہے۔ فیصل آباد میں بھی سمندری روڈ پر دسوا نامی ایک گاؤں موجود ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو ہشیار پور کے دسواں گاؤں سے آئے اور انھوں نے اپنے آبائی گاؤں کے نام پر اس گاؤں کا نام بھی دسوا ہی رکھا۔ مجھے اس بات کا شک ہے کہ جب یہ لوگ ہجرت کے وقت آئے تب انھوں نے دسوا رکھا یا جب انگریزوں نے اس علاقے کو آباد کیا گیا تو آنے والے لوگوں نے اس گاؤں کا نام دسوا رکھا۔ یہ بات بھی درست ہے کہ فیصل آباد میں بہت سے دیہاتوں کے نام لوگوں نے ہندوستان میں اپنے دیہات کے نام پر رکھے ہوئے ہیں جن میں دسوا بھی شامل ہے۔

اس علاقے میں بھی مسلمانوں اور مقامی حکمرانوں کے درمیان کئی جنگیں ہوئیں۔ مغلیہ سلطنت کے خاتمے کے بعد رنجیت سنگھ نے یہ علاقہ فتح کیا اور اسے اپنی ریاست میں شامل کرلیا۔ ہشیارپور کے ساتھ ہی ایک بڑا قصبہ موجود ہے جس کا نام بجواڑہ ہے۔ اس نام کا ایک گاؤں ٹوبہ ٹیک سنگھ کے پاس بھی ہے۔ یہ لوگ شاید اسی علاقہ سے آئے ہوں گے۔ مجھے یاد ہے کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ میں غلہ منڈی کے پاس ہے ایک پیر صاحب رہتے تھے جنھیں ہم بجواڑے والے پیر کہتے تھے۔

تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ یہ قصبہ کوہ سلیمان، ڈیرہ غازی خان سے آنے والے پٹھانوں نے آباد کیا تھا۔ ان کا یہاں آنے کا مقصد پہاڑی علاقوں میں قائم ہندو ریاستوں کا راستہ روکنا تھا تاکہ انھیں پنجاب پر حملوں سے روکا جاسکے جہاں مسلمان ریاستیں آباد تھیں۔ اسی شہر کے ایک پٹھان ہشیار خان کے نام پر اس شہر کا نام رکھا گیا۔ زمانہ قدیم میں اس کے کئی اور نام بھی تھے لیکن مسلمانوں کی آمد کے بعد اس شہر کو ہشیارپور کہا جانے لگا۔

ہشیارپور کی شرح خواندگی اس علاقے میں سب سے زیادہ ہے جو کہ تقریباً نوے فیصد ہے۔ ایک اور بات جو مجھے بہت مختلف نظر آئی وہ یہ کہ ہشیارپور میں عورتوں کی تعداد مردوں کے برابر ہے جبکہ پنجاب اور ہریانہ میں خواتین کی تعداد مردوں کی نسبت کافی کم ہے۔ ہشیارپور میں ریلوے کا نظام بیسویں صدی کے آغاز میں قائم ہوا اور یہاں کا موجودہ ریلوے سٹیشن 1905ء میں بنایا گیا۔

پنجاب یونیورسٹی چنڈی گڑھ: جو 1882ء میں بنائی گئی

انگریزوں نے 1882ء میں پنجاب یونیورسٹی لاہور کی بنیاد رکھی۔ اس سے قبل انگریزوں نے ہندوستان میں مدراس، کلکتہ اور بمبئی میں تین یونیورسٹیاں قائم کی تھیں

اور یہ ان کی چوتھی یونیورسیٹی تھی۔ جب تقسیم پنجاب ہوئی تو اسے بھی دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ میرے علم کے مطابق اس وقت موجودہ پاکستان اور بھارتی پنجاب میں صرف یہی ایک یونیورسٹی تھی۔ تقسم ہند کے بعد پنجاب بھی دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ اس وقت پنجاب یونیورسٹی لاہور میں ایک کثیر تعداد میں ہندو اور سکھ طالبعلم تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ اسی طرح اساتذہ میں بھی ایک واضح تعداد ہندوؤں اور سکھوں کی شامل تھی۔ تقسیم پنجاب ہوئی تو وہ لوگ بھارتی پنجاب چلے گئے۔ اس موقع پر ایک دلچسپ واقع بھی پیش آیا۔

جب طلبا اور اساتذہ کی کثیر تعداد بھارتی پنجاب چلی گئ تو ان کی تعلیم کا مسئلہ در پیش ہوا کیونکہ پہلے سے اس علاقے میں کوئی یونیورسٹی بھی موجود نہیں تھی۔ یہ بھی یاد رہے کہ متحدہ پنجاب کا صدر مقام لاہور تھا۔ تقسیم کے بعد بھارتی پنجاب کا عارضی صدر مقام شملہ بنا جسے بعد میں چندی گڑھ منتقل کر دیا گیا۔ایسی صورت حال میں بھارت نے فیصلہ کیا کہ پنجاب یونیورسٹی کے نام سے ہی شملہ میں ایک یونیورسٹی قائم کی جائے۔ کچھ سال تک اس کا ایک عارضی کیمپس شملہ میں کام کرتا رہا اور بعد میں اسے چندی گڑھ منتقل کر دیا گیا۔

بھارتی پنجاب کے لوگوں کا یہ کہنا ہے کہ پنجاب یونیورسٹی چندی گڑھ ،اسی پنجاب یونیورسٹی کا ایک حصہ ہے جو 1882ء میں بنائی گئ تھی۔ جیسے پنجاب تقسیم ہوا ویسے ہی پنجاب یونیورسٹی بھی تقسیم ہوئی۔

میرے علم کے مطابق ایسی تقسیم شاید ہی کہیں ہوئی ہو۔ پنجاب یونیورسٹی چندی گڑھ کی ویب سائٹ پر اس کی بنیاد کی تاریخ 1882ء ہی لکھی ہوئی ہے جبکہ اس وقت چندی گڑھ کا کوئی وجود بھی نہیں تھا۔اس یونیورسٹی کا موٹو ہے:

Lead us into the light from darkness

پنجاب یونیورسٹی ہشیار پور کے کیمپس کے لیے ڈاکٹر لاجپت رائے، جو اس وقت امریکہ میں رہتے اور ان کا آبائی تعلق اسی علاقے سے ہے، نے جگہ خرید کر دی۔

تقسیم ہند سے قبل اس شہر میں مسلمان آبادی کا تقریباً تیسرا حصہ تھے۔جو اب ایک فیصد سے بھی کم ہیں اور یہاں ساٹھ فیصد سے زائد ہندو اور تیس فیصد سے زائد سکھوں کی آبادی ہے۔ تقسیم ہند کے موقع پر ظلم و ستم کا ایک بازار گرم ہوا۔ کچھ مارے گئے باقی جو جان بچا کر بھاگ سکتے تھے بھاگ گئے۔اب اس شہر میں ایک بہت بڑی تعداد ان ہندوؤں اور سکھوں کی ہے جو پاکستان سے لٹ پٹ کر آئے تھے۔

روئے تسی وئی روئے ایس دی آں۔۔۔

ایسا دونوں طرف ہی ہوا۔۔۔ کیوں ہوا۔۔۔ کس نے کیا۔۔۔ اس کے جواب کی تلاش رہے گی۔۔

اس شہر سے تعلق رکھنے والے چند مشہور لوگوں کے نام کچھ یوں ہیں۔

گیانی ذیل سنگھ بھارت کے صدر، من موہن سنگھ بھارت کے وزیرِاعظم، انھوں نے اپنی تعلیم اسی شہر میں مکمل کی، جگجیت سنگھ چوہان خالصہ راج پارٹی کے بانی، پاکستان کرکٹ کے مشہور کھلاڑی انتخاب عالم، استاد امانت علی، تیسرا نشان حیدر حاصل کرنے والے میجر طفیل شہید۔دو ایسی شخصیات جن کے نام اور کام سے ہر کوئی واقف ہے، حبیب جالب اور منیر نیازی کی پیدائش اور گزربسر بھی اسی شہر کی ہے۔

Panjab University Chandigarh
Photo Credit: https://institutes.aglasem.com/pu/

ابھی سرہند دور تھا

اب تقریباً دوپہر کے بارہ بج رہے تھے اور ہمیں سرہند پہنچنے کے لیے ابھی بھی ایک گھنٹہ درکار تھا اگر بھوک اور تھکاوٹ کا ملاپ ہو جائے اور دیس بھی پرایا ہو، جہاں آپ پہلی مرتبہ جا رہے ہوں، تو صورتحال کچھ زیادہ خوشگوار نہیں ہوتی۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ نوجوان بچے ہمارے ساتھ تھے جو عام طور پر اس طرح کے ماحول کے عادی بھی نہیں تھے، لیکن سفر تو بہرحال سفر ہی ہوتا ہے اس کے لیے کچھ نہ کچھ تکلیف تو ضرور برداشت کرنی پڑتی ہے۔

جالندھر سے نکلنے کے بعد ہمارے راستے میں پہلا قصبہ پھلور آیا۔ اس نام کا ایک قصبہ رجانہ اور سمندری کے درمیان بھی واقع ہے۔ جو پھلور سے آنے والے لوگوں نے ہی بسایا ہے۔ اس کے بعد وہ شہر آرہا تھا جسے دیکھنے کی چاہت اور تمنا بچپن سے ہی میرے دل و دماغ پر چھائی ہوئی تھی، یعنی لدھیانہ۔

ایسا ہونے کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ میرے پیرو مرشد مولانا عبدالحمید لدھیانوی، جو ٹوبہ ٹیک سنگھ میں رہتے تھے کا تعلق لدھیانہ سے تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ پاکستان بھر میں ایک بڑی تعداد لدھیانہ سے تعلق رکھنے والے علماء کرام کی بھی موجود ہے۔ یہ

وہ شہر ہے جسے ایک مسلمان نے آباد کیا تھا۔ کبھی اس شہر میں ساٹھ فیصد سے زائد مسلمان آباد تھے جو آج دو فیصد بھی نہیں ہیں۔

دوسری بڑی وجہ یہ تھی کہ فیصل آباد ،جو کہ پاکستان کا ٹیکسٹائل کے لحاظ سے دوسرا بڑا شہر ہے اسے اس مرتبے تک پہنچانے میں ان لوگوں کا بہت بڑا ہاتھ ہے جو تقسیم پنجاب کے وقت لدھیانہ سے فیصل آباد آئے تھے۔ اجاڑے کے وقت فیصل آباد سے ایک بہت بڑی تعداد میں ہندو اور سکھ مشرقی پنجاب چلے گئے اس وقت حکمرانوں نے یہ طے کیا تھا کہ جہاں سے لوگ ایک ملک سے جائیں گے تو وہیں پر دوسرے ملک سے آنے والے لوگوں کو بسایا جائے گا اور ان کی بچی ہوئی جائیداد بھی انھیں دی جائے گی۔ اس لیے فیصل آباد میں ٹیکسٹائل سے تعلق رکھنے والوں کی اکثریت لدھیانہ کے ارد گرد سے ہی تعلق رکھتی ہے۔ وہ لوگ لدھیانہ میں بھی ٹیکسٹائل کا کام ہی کرتے تھے۔ لدھیانہ ایک طویل عرصے سے بھارت بھر میں ہوزری کی مصنوعات کے لیے بے حد مشہور ہے۔ ان دو وجوہات کی وجہ سے مجھے لدھیانہ دیکھنے میں بے حد دلچسپی تھی۔

ہمارا لدھیانہ میں رکنے کا کوئی امکان نہیں تھا لیکن جس چیز سے آپ کو بہت محبت ہو اسے دور سے دیکھنے سے ہی آپ کو راحت مل سکتی ہے اور ایسا ہی میرے ساتھ بھی ہونے جا رہا تھا۔

ہمارے راستے میں گورایا نام کا ایک قصبہ بھی تھا۔ گورایا جاٹوں کی ایک گوت ہے، ہو سکتا ہے کہ گورایا جاٹ یہاں رہتے ہوں۔ سیالکوٹ، نارووال میں بڑی تعداد میں گورایا جاٹ رہتے ہیں۔ شاید وہ لوگ بھی یہاں سے ہی ہجرت کرکے پاکستان گئے ہوں۔ ہمارے دائیں طرف نکودر، موگا اور شاہکوٹ جیسے قصبے تھے۔

ان سب کا تعارف تو بہت مشکل ہے لیکن میں لدھیانہ پہنچنے سے پہلے نکودر اور پھلور کا تعارف ضرور کروانا چاہوں گا۔

نکودر: جو کبھی نیکی کا در تھا، جسے ایرانی مسلمانوں نے آباد کیا

جی ٹی روڈ سے دائیں طرف تقریباً پندرہ کلومیٹر کے فاصلے پر نکودر نامی کا ایک قصبہ موجود ہے۔ جسے ایرانی مسلمانوں نے آباد کیا تھا اور اس کا نام "نیکی کا در" یعنی نیکی کا دروازہ رکھا گیا تھا جو بعد میں نکودر بن گیا۔ ضلع جہلم میں دینہ کے پاس بھی ایک قصبے کا نام نکودر ہے۔

یہ شہر سلاطین دہلی کے وقت سے آباد ہے۔ تاریخ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اس علاقے میں تین بڑی قومیں آباد ہیں؛ ارآئیں، جاٹ، اور کمبوج، انھیں کمبوہ بھی کہا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ مسلمان راجپوتوں کے بہت سے قبائل بھی یہاں آباد ہیں۔ کسی دور میں یہاں راجپوتوں کے ایک قبیلے خانزادہ کی حکومت تھی وہ خاندان، جہانگیر کے دربار سے تعلق رکھتا تھا۔ جہانگیر نے انھیں یہاں پر ایک بڑی جاگیر بھی دے رکھی تھی۔ بعد ازاں خانزادہ خاندان کو سکھوں نے شکست دی اور 1816ء یہ شہر مہاراجہ رنجیت سنگھ کی ریاست کا حصہ بن گیا۔

Tombs of Ustad and Shagard Photo Credithttps://en.wikipedia.org/wiki/Nakodar

اس شہر میں دو اہم مقبرے ہیں جنھیں استاد شاگرد کا مقبرہ کہا جاتا ہے۔ اس طرح کے دو مقبرے سرہند میں بھی ہیں۔ان میں سے استاد کے مقبرے کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ شاہجہاں کا استاد تھا۔ ان مقبروں کی عمارات حیران کن ہیں۔ اتنی خوبصورت عمارتیں کم ہی دیکھنے کو ملتی ہیں۔

میں اس بات کی کھوج میں لگا رہا کہ وہ کس علم کے استاد تھے۔ شاہجہاں نے ان سے کیا سیکھا؟ لیکن کچھ خاص بات معلوم نہ ہو سکی۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ وہ موسیقی کے استاد تھے۔ان مقبروں کی عمارات دیکھنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ وہ تعمیرات کے ماہر تھے۔ شاہجہاں کی تعمیرات کے پیچھے ان مزارات میں لیٹے استاد شاگرد کی سوچ کی کارفرما تھی، یہ بات کہاں تک درست ہے، معلوم نہیں۔

اس کے علاوہ یہاں پر بابا مراد شاہ کا بھی ایک مقبرہ ہے جس پر ہر سال ایک بہت بڑا میلہ لگتا ہے۔ یہ زیادہ پرانی بات نہیں ہے بلکہ تقسیم ہند کے بعد 1908ء میں ان کا یہ مزار بنایا گیا۔ پنجابی کے مشہور گلوکار گرداس مان بھی انھی کے شاگرد ہیں۔ اسکے ساتھ ساتھ یہاں پر سائیں لاڈھی کا مزار بھی ہے۔ تقسیم پنجاب سے قبل اس علاقے میں مسلمانوں کی آبادی ساٹھ فیصد سے زائد تھی، جو اب دو فیصد سے بھی کم ہے۔

مغلیہ سلطنت سے قبل اور اس کے بعد بھی دہلی اور لاہور کے درمیان حکمرانوں کا آنا جانا لگا رہتا تھا اور انھوں نے اپنی سہولت اور آرام کیلیے باغات اور عمارتیں بھی بنائیں، جنھیں ہم سرائے کہتے ہیں۔ اسی طرح کے ایک باغ کا ذکر جس کا نام خاص باغ ہے، میں نے سرہند کا ذکر کرتے ہوئے کیا ہے۔ جالندھر کے بعد جی ٹی روڈ پر اسی طرح کی ایک

عمارت جہانگیر پنڈ "گاؤں" کے پاس بھی موجود ہے۔ اس گاؤں کا نام جہانگیر بادشاہ کے نام پر رکھا گیا۔ مغل حکمرانوں نے یہاں پر ایک سرائے بنائی گئی جسے دکھنی، یعنی جنوبی سرائے کہتے ہیں۔ اسے جہانگیر کا قلعہ بھی کہا جاتا ہے۔

پرانے وقتوں میں مشرق مغرب شمال جنوب کو پُورب کے پچھم، اتر اور دکھن کا نام دیا جاتا تھا۔ پورب مشرق پچھم مغرب، اتر شمال اور دکھن جنوب کو کہتے ہیں۔

مجھے یاد ہے کہ میرے دادا (اللہ ان کی مغفرت فرمائے) بھی دکھن کا لفظ ہی استعمال کرتے تھے۔ کئی شاعروں نے بھی یہ لفظ استعمال کیا ہے۔ میں کچھ شاعروں کے شعر یہاں پر نقل کر رہا ہوں جن میں یہ لفظ استعمال کیے گئے ہیں۔

در ملک ہند، پورب و پچھم ہے سوگ میں

سب سے ادھک عزا ہے بہ دکھن حسین کا

(مرزا)

رات نے خیمے ڈیرے ڈالے ہولے ہولے کہاں کہاں

پورب پچھم اتر دکھن پھیلا کالا بھبھوت دھواں

(ابن انشاء)

ان کی پوری نظم کچھ یوں ہے:

شام ہوئی ہے ڈگر ڈگر میں پھیلی شب کی سیائی ہے
پچھم اور کبھی کا ڈوبا، چار پہر کا راہی ہے
آج کا دن بھی آخر بنتا جگ جگ کا جنجال لیے
اندھیارے نے ایک جھپٹ میں چاروں کوٹ سنبھال لیے
رات نے خیمے ڈیرے ڈالے ہولے ہولے کہاں کہاں
پورب پچھم اتر دکھن، پھیلا کالا بھبھوت دھواں
سانجھ سمے کی چھایا بیری، اس کا ناش ناش ہو
دھند کا پھندا جگ جگ پھیلا اندھا نیل آکاش ہوا
سہما سہما ریل کے کالے پل پر دیر سے بیٹھا ہوں
سوچ رہا ہوں سیر تو ہولی ٹھہروں یا گھر لوٹ چلوں
شنٹ کے انجن دھواں اڑاتے آتے ہیں کبھی جاتے ہیں
رنگ برنگے سنگنل ان کو کیا کیا ناچ نچاتے ہیں
جنگلے پر پل کو جھکا اور انگلیوں سے اسے تھپکا یا
کوئی مسافر مزے مزے میں پیت کا گیت الاپ چلا
چھاؤنی کے ایک کمپ کا گھنٹہ ٹن ٹن آٹھ بجاتا ہے
شنٹ انجن دھواں اڑاتا آتا ہے کبھی جاتا ہے
اج کی رات اماوس ہے آج گگن پر چاند نہیں
تبھی تو سائے گھنے گھنے ہیں تبھی ستارے ماند نہیں
تبھی تو من میں پھیل چلا الجھا الجھا سوچ کا جال
کل کی یادیں آج کی فکریں آنے والے کل کا خیال
کال کی باتیں کھیتی کھیتی، بستی بستی، گلی گلی

جنگ کے چرچے محفل محفل، گدھوں کی تقدیر بھلی
ایک پہر سے اوپر گزرا سورج کو است ہوئے
کھیت کے جھینگر سوندھی سوندھی خوشبو پا کر مست ہوئے
تن تن تن تن، دب دب دب دب دب الجھی الجھی دبی دبی
ایک بجے کی نوبت شاید وقت سے پہلے بجا ٹھی
طوفانی جیکاروں کا اک شور سر صحرا اٹھا
کان بجے یا دشت میں گونجی گھوڑوں کی ٹاپوں کی صدا
کوچ کرو دل دھڑکے بولے پچھم کو اٹھ جانا ہے
کمپ کنارے باجا باجے دور کا دیس بسانا ہے
ایک سجیلی بستی دائیں، ایک البیلا رستہ بائیں
دیر سے کالے پل پہ کھڑے ہیں اے دل آج کدھر کو جائیں
لہک لہک کر قرنق چیخے دل کے تئیں بلوان کرے
کھن کھن کھن کھن کھنڈرا باجے کیا کیا کتھا بیان کرے
اجلی خندق اپنے ہی جیالوں کے لہو میں نہائی ہے
جیت نے جھلسی ویرانی کی شوبھا اور بڑھائی ہے

میں بات دکھنی سرائے کی کر رہا تھا کہ بیچ میں دادا جان کی یاد آئی، جو کہ ایک فطری بات تھی۔ میں اپنی زندگی میں والد صاحب کے ساتھ ساتھ اپنے دادا جی سے بہت زیادہ متاثر ہوں۔ دکھنی سرائے ،جس کی میں نے بہت سی ویڈیو دیکھی ہیں بہت ہی خوبصورت تھی۔ اس کی وجہ اس کے کمرے اور مسجد کا اہتمام ہے۔ اس میں باغات بھی ہیں اور خوشی کی بات یہ ہے کہ اب تک اس کی اچھی دیکھ بھال بھی کی جا رہی ہے اور اب یہ ایک اچھا تفریحی مقام بھی ہے۔

دکھنی سرائے، جسے جہانگیر کا قلعہ بھی کہتے ہیں، 1640ء میں علی مردان خان نے تعمیر کروائی تھی جو شاہجہاں کا گورنر تھا۔ اس وقت شاہجہاں کی حکومت تھی اور جہانگیر کی وفات ہو چکی تھی۔ اس کے بیٹے شاہ جہاں نے اپنے والد کے نام پر اس گاؤں کو آباد بھی کیا اور یہاں سرائے بھی بنوائی جو قلعہ تو نہیں ہے لیکن لوگ اسے قلعہ بھی کہتے ہیں۔

کہتے ہیں کہ دلی اور لاہور کے درمیان سات مختلف مقامات پر سرائیں بنائیں گئیں تھیں۔ یہ سرائے مغلیہ طرز تعمیر کی ایک بہت ہی خوبصورت مثال ہے۔ اس کے چاروں طرف اونچی دیوار اور تین منزلہ دو بڑے گیٹ بھی ہیں۔ جس گیٹ کا رخ دہلی کی طرف تھا اسے دہلی گیٹ کا نام دیا گیا جبکہ دوسرے کو لاہوری گیٹ کا نام دیا گیا کیونکہ اس کا رخ لاہور کی طرف ہے۔ اس میں تقریباً ایک سو چوبیس کمرے بہت بڑی مسجد اور باغ ہیں۔

اس عمارت کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ اس علاقے کی ایک بہت ہی خوبصورت عمارت ہے۔ بہت سے لوگوں نے اسکی وڈیوز بھی بنائی ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے واقعی یہ جگہ قابلِ دید ہے۔

پھلور: رنجیت سنگھ کا قلعہ، ایک زندہ صوفی کا دفن

پھلور لدھیانہ سے پندرہ کلومیٹر پہلے موجود ایک بڑا قصبہ ہے۔ یہ بھی ایک تاریخی قصبہ ہے۔ جی ٹی روڈ پر واقع ہونے کی وجہ سے زمانہ قدیم سے لوگ لاہور اور دہلی کے درمیان اسی راستے سے سفر کرتے تھے۔ شاہجہان نے یہاں پر بھی ایک شاہی سرائے بنائی تھی۔ جسے رنجیت سنگھ نے انیسویں صدی کے شروع میں ایک قلعے میں بدل دیا۔ اسے دیوان محکم چند نے فرانسیسی اور اٹلی کے ماہرین کی مدد سے تیار کیا تھا۔ اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اس وقت رنجیت سنگھ کی فوج میں فرانسیسی اور اٹالین لوگ بھی

ملازمت کے لیے آتے تھے۔ یقینی طور پر وہ یہاں پر قبضے کرنے کے لیے نہیں آئے تھے۔ ان کے ساتھ کوئی فوج نہیں تھی۔ وہ رنجیت سنگھ کی فوج میں ملازم تھے اور اس کی خاطر جنگ بھی لڑتے تھے۔ یقیناً مارے بھی جاتے ہونگے۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے آج ہم یورپ میں ملازمت کے لیے جاتے ہیں۔

سکھوں کو شکست دینے کے بعد انگریزوں نے اس قلعے پر قبضہ کرلیا۔ تاریخ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ انیسویں صدی کے آخر میں انھوں نے یہاں پر ایک پولیس ٹریننگ اکیڈمی بھی بنائی۔ بھارتی حکومت نے چند دہائیاں قبل اس کا نام مہاراجہ رنجیت سنگھ پولیس اکیڈمی رکھ دیا ہے۔ یہ ہندوستان کی سب سے قدیم پولیس اکیڈمی ہے۔ یاد رہے انگریزوں نے 1860ء میں ہندوستان بھر میں پولیس ایکٹ لاگو کیا تھا۔

اس شہر کے نام کے بارے میں مشہور عام روایت کے مطابق ایک مقامی جٹ پھول کے نام پر اس کا نام پھول نگر رکھا گیا جو بعد میں پھول نگر سے پھلور ہو گیا۔ یہاں پر بنائی گئی سرائے، مغل حکمرانوں کے ڈاک کے انتظام کا ایک حصہ تھی۔

میں نے پچھلے صفحات میں اس بات کا ذکر کیا ہے کہ انگریزوں اور رنجیت سنگھ کے درمیان ایک معاہدہ ہوا تھا جس کے مطابق ستلج کے مغرب کی طرف کے تمام علاقہ جات رنجیت سنگھ کے پاس تھے جبکہ ستلج کے مشرقی علاقے انگریزوں کے پاس تھے۔ اس لحاظ سے پھلور انگریزوں اور سکھوں کی ریاست کے درمیان ایک سرحدی شہر تھا۔ اسی معاہدے کے تحت انگریزوں نے لدھیانہ میں فوجی چھاؤنی بھی بنائی تھی۔ ستلج دریا لدھیانہ اور پھلور کے درمیان بہتا ہے۔ ایک طویل عرصے تک پہاڑی علاقوں سے لکڑی کاٹ کر ستلج دریا میں ڈال دی جاتی تھی اور اسے پھلور سے نکال لیا جاتا تھا۔ اسی وجہ سے پھلور لکڑی کی ایک بڑی مارکیٹ بھی تھا۔ تحصیل پھلور کی آبادی ایک لاکھ سے بھی کم ہے

جس میں آ باد مسلمان آ بادی کا ایک فیصد بھی نہیں، ہیں جو کبھی نصف حصہ ہوا کرتے تھے۔

ہندوؤں کی ایک بہت مشہور نظم "جےئ جگ دیش" سے متعلق یہ بھی کہا جاتا ہے کہ شارداہ رام پھلوری یہیں بیٹھ کر لکھتا تھا۔ پھلور میں پیر بابا عبداللہ شاہ غازی کا مزار بھی ہے۔ جو بہت ہی نیک اور خداترس تھے۔ اب تک لوگ ان کا نام عزت سے لیتے ہیں۔

اس قلعے کے بارے میں پولیس اکیڈمی کی ویب سائٹ پر ایک بہت ہی عجیب و غریب واقعہ بھی لکھا ہوا ہے۔ جس کے مطابق جب قلعے کی دیوار بنائی جارہی تھی تو ایک دیوار کو جب بھی بنایا جاتا وہ رات کو گر جاتی تھی۔ رنجیت سنگھ نے اس بارے میں کئ سنتوں سے مشورہ کیا اور یہ طے پایا کی ایک ایسا لڑکا جو کسی بیوہ کا اکلوتا بیٹا ہو، اس کی قربانی دی جائے گی تو پھر ہی یہ دیوار سلامت رہ سکتی ہے۔ اسکے بعد کسی بچے کی تلاش شروع کی گئ۔ ایک برہمن بیوہ ہندو عورت کے بچے کو تلاش کیا گیا۔ جب یہ بات اس کی ماں کو پتہ چلی کہ اس کے بچے کی قربانی کی جارہی ہے تو اس نے بہت چیخ و پکار کی لیکن اسے کوئی سننے والا نہیں تھا۔

اس وقت عبداللہ شاہ زندہ تھے۔ انھوں نے رنجیت سنگھ سے کہا کہ اگر اسے قربان کردیا جائے اور بچے کو چھوڑ دیا جائے تو بھی دیوار قائم رہ سکتی ہے۔ رنجیت سنگھ نے بچے کو چھوڑ دیا اور عبداللہ شاہ کو زندہ دیوار میں چن دیا گیا۔ یہ جگہ قلعے کی شمال مغربی دیوار کے پاس ہے۔ اس واقعہ کے کئ سال بعد یہاں پر ایک مزار بنادیا گیا۔ اس مزار پر ہندو ، سکھ اور مسلمان بڑی تعداد میں آتے ہیں اور اکیڈمی میں تربیت حاصل کرنے والے پولیس والے بھی ان کے مزار پر حاضری دیتے ہیں۔

اس واقعہ پر یقین کرنا تو مشکل ہے لیکن اس کی شہادت ایک سرکاری ذرائع سے حاصل ہو رہی ہے اس لیے تسلیم کرنا بنتا ہے۔

اس طرح ایک مسلمان صوفی نے اپنی جان دے کر ایک بیوہ کے اکلوتے بچے کی جان بچائی۔۔۔ یہ بھی تصویر کا ایک رخ ہے!

Mazar Baba Abdullah Shah at Phillaour Police Academy

Photo Credithttps://www.facebook.com -

اس اکیڈمی سے تربیت حاصل کرنے والے مقامی لوگ انگریزوں کے دست راست ہوتے تھے۔ اس کا بنیادی مقصد شمالی اور مغربی ہندوستان میں پولیس کے نظام کے لیے افرادی قوت مہیا کرنا تھا۔ چند سال قبل پھلوری کے نام سے ایک پنجابی فلم بھی بنائی گئی۔ جو بھارتی پنجاب میں خاصی مقبول ہوئی۔

Fort of Phillaur
Built by
Maharaja
Ranjeet Singh Ji!
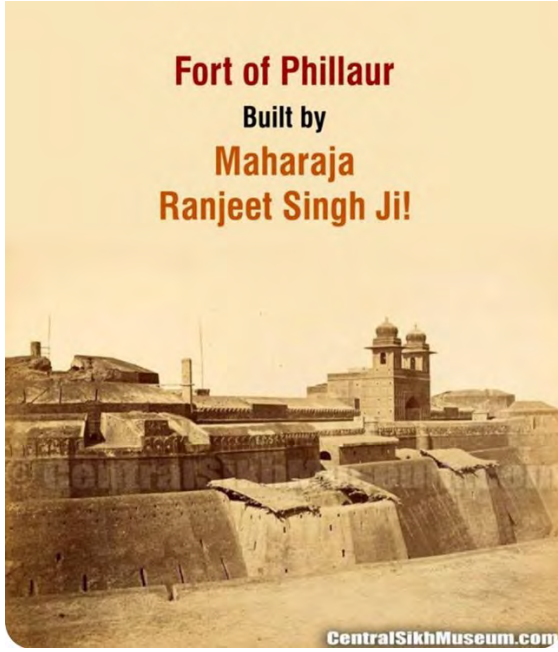
Phillaur Fort Photo Credit: Central Sikh Museum

لدھیانہ: جو دراصل لودھی آنہ تھا، جہاں مسلمان اکثریت میں تھے

دریائے ستلج مہاراجہ رنجیت سنگھ اور انگریزوں کے درمیان ایک طے شدہ سرحد کا کام کرتا ہے۔

ستلج کے پل کے دوسری طرف وہ شہر تھا جسے دیکھنے کی مجھے بے حد خواہش تھی۔ جب میں اس شہر سے گزرا تو میرے پیر و مرشد مفتی عبدالحمید لدھیانوی کی شخصیت دل و دماغ پر چھا گئی۔ انھوں نے اپنی تعلیم دیوبند سے مکمل کی اور تقسیم ہند کے بعد ٹوبہ ٹیک سنگھ میں رہائش پذیر ہوئے تھے۔ آپ ٹوبہ ٹیک سنگھ کی ایک بہت بڑی دینی، سیاسی اور سماجی شخصیت تھے۔ میں ان کے پاس اکثر جایا کرتا تھا۔ لدھیانہ کی پنجابی زبان ہماری پٹیالہ

زبان سے تھوڑی سی مختلف ہے۔ وہ لدھیانوی لہجے کی پنجابی میں باتیں کرتے تھے۔انھیں عربی، فارسی اور اردو کے بے شمار اشعار زبانی یاد تھے۔انھوں نے عمر بھر کمیٹی باغ میں ہی عید کی نماز پڑھائی۔ ان کے بعد ان کے بھائی اب ان کے بڑے بیٹے نماز پڑھاتے ہیں۔ میں اس شہر کو دیکھنا چاہ رہا تھا جہاں مفتی صاحب پیدا ہوئے اور بڑے ہوئے۔ میری وہ خواہش پوری ہوئی گو کہ میں یہاں رک نہ سکا۔ میں آپ کو یہ بتانا چاہوں گا کہ تقسیم ہند سے قبل لدھیانہ میں مسلمانوں کی تعداد دو تہائی ہوا کرتی تھی جہاں آج ایک فیصد مسلمان بھی نہیں ہیں۔

لدھیانہ کا تاریخ میں کیا مقام ہے، اسے کس نے بسایا اور اب بھارت کی معاشی اور معاشرتی زندگی میں اس کا کتنا عمل دخل ہے؟اس کا ایک مختصر احوال پیش خدمت ہے۔

میں نے کبھی یہ سوچا بھی نہیں تھا کہ لدھیانہ کا نام کسی لودھی کے نام پر ہے۔جب میں نے اس کی تاریخ پڑھی تو پتہ چلا کہ پندرہویں صدی میں سکندر لودھی کے دو جرنیلوں، ایک کا نام یوسف خان اور دوسرے کا نام نہاند خان نے یہاں پر ڈیرے ڈالے تاکہ وہ لودھی سلطنت کو شمال مغرب سے آنے والے حملہ آوروں سے بچا سکیں۔ یوسف خان نے دریائے ستلج کے دوسری طرف سلطان پور لودھی کے نام سے ایک شہر کی بنیاد رکھی۔ نہاند خان نے امیر ہوتا نام کے گاؤں کے مقام پر لودھی آنہ کی بنیاد رکھی۔ مجھے نہیں یاد کہ کبھی بھی مفتی صاحب نے لدھیانہ کے نام سے متعلق کوئی بات کی ہو۔ اس لیے اس طرف دھیان ہی نہیں گیا کہ یہ لدھیانہ درحقیقت لودھی آنہ تھا جو چلتے چلتے لدھیانہ بن گیا۔

Lodhi Fort at Ludhiana Photo Credit:
https://www.tourtravelworld.com

Lodhi Fort Ludhiana Photo Credit:
https://www.tourmyindia.com

ایک اندازے کے مطابق اس کی آبادی بیس لاکھ کے قریب ہے اور یہ ستلج کے پرانے کنارے پر واقع ہے۔جو اس کے جنوب میں کئی کلومیٹر کے فاصلے پر بہہ رہا ہے۔ یہ بالکل اسی طرح سے ہے جیسے لاہور کا قلعہ کبھی دریائے راوی کے کنارے پر تھا اب اس سے کئی کلومیٹر دور بہہ رہا ہے۔ لدھیانہ کو بھارت کا مانچسٹر بھی کہا جاتا ہے۔ بالکل ایسے ہی جیسے فیصل آباد کو پاکستان کا مانچسٹر کہا جاتا ہے۔ یہ دہلی سے تقریبا تین سو کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے پرانے شہر کی طرح یہ شہر بھی دو حصوں میں تقسیم ہے،ایک پرانا اور ایک نیا۔

اس شہر میں ستر فیصد کے قریب ہندو، پچیس فیصد سے زائد سکھ جبکہ صرف دو سے تین فیصد کے درمیان وہ لوگ رہتے ہیں جن کے نام پر اس شہر کا نام رکھا گیا، یعنی مسلمان۔ یاد رہے تقسیم ہند سے قبل اس شہر میں ساٹھ فیصد سے زائد مسلمان آباد تھے۔ تقسیم پنجاب کی وجہ سے مسلمان یہاں سے ہجرت کرنے پر مجبور کر دیئے گئے اور جو بھاگ نہ سکے انھیں بے دردی سے قتل کر دیا گیا۔ پاکستان سے نقل مکانی کرنے والے ہندوؤں اور سکھوں کو اسی شہر میں بسایا گیا ہے۔

اس شہر کی کئی بڑی خصوصیات ہیں جن میں ایک اہم یہ ہے کہ ایشیاء میں یہاں سب سے زیادہ بائیسکل بنائے جاتے ہیں اور ان کی تعداد ایک کروڑ سالانہ سے بھی زیادہ ہے۔ ہندوستان میں بنائے جانے والے ٹریکٹرز کے پرزوں کا تقریباً دو تہائی بھی اسی شہر میں بنایا جاتا ہے۔اس شہر کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ یہ جرمنی کو بھی ایسے پرزے برآمد کرتا ہے جو مرسڈیز کاروں میں استعمال کیے جاتے ہیں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ گھریلو سلائی مشین بنانے بنانے میں اس شہر کا کوئی ثانی نہیں ہے۔

اس شہر کی ایک اور پہچان ہوزری کی مصنوعات بھی ہیں۔ خاص طور پر سویٹر کے لیے یہ دنیا بھر میں جانا جاتا ہے۔ اس کے بعد یہاں کی ٹی شرٹ بھی بہت مشہور ہے۔ اسی وجہ سے اسے بھارت کا مانچسٹر کہتے ہیں۔ یہ پنجاب کا سب سے بڑا شہر ہے۔ اس علاقے میں کبڈی بڑے شوق سے کھیلی جاتی ہے اور یہاں کا گرونانک سٹیڈیم کبڈی کے میچوں کے لیے بہت مشہور ہے۔ اس کے علاوہ یہاں پر کئی مشہور گردوارے اور مندر بھی موجود ہیں۔

اگر آپ کو بھی پنجاب کی تاریخ پڑھنے کا موقع ملا ہو تو آپ نے کھنہ شہر کا نام ضرور پڑھا ہو گا جو لدھیانہ اور سرہند کے درمیان واقع ہے، وہ ہندوستان کی سب سے بڑی اناج کی منڈی ہے۔ اس کا تفصیلی ذکر آگے آئے گا۔ یہاں پر ایک بہت ہی مشہور سرائے لشکری

خان ہے جو مغلوں کے دور میں بنائی گئی تھی، اسے اورنگ زیب کے ایک گورنر نے بنایا تھا۔ یہ سرائے بھی دیکھنے کے قابل ہے۔

لدھیانہ کو تعلیم کے میدان میں بھی ایک بہت اعلی مقام حاصل ہے یہاں پر تین ہزار سے زائد پرائمری اور سیکنڈری سکول موجود ہیں۔ یہ بات بھی کافی اہم ہے کہ لدھیانہ میں دنیا کی بڑی زرعی یونیورسٹیز میں سے ایک پنجاب ایگریکلچر یونیورسٹی بھی موجود ہے۔

پنجاب ایگریکلچر یونیورسٹی 1962ء میں بنائی گئی۔ 1894ء میں انگریزوں نے یہاں پر میڈیکل کالج بنایا۔ جہاں پہلی مرتبہ عورتوں کے لیے میڈیکل کی تعلیم کا بندوبست کیا گیا۔ اس بات کا سہرا ایک انگریز خاتون Dame Edith Mary Brown کے سر ہے۔ اس شہر سے تعلق رکھنے والی بہت سی نامور سیاسی، ادبی، فلمی شخصیات بھی دنیا بھر میں مشہور ہیں۔ جن میں سے چند ایک کا ذکر یہاں ضروری ہے۔

آپ نے بھگت سنگھ کا نام تو سنا ہی ہوگا، اس کا ایک ساتھی سکھدیو تھاپر بھی اسی شہر سے تعلق رکھتا تھا جسے بھگت سنگھ کے ساتھ ہی پھانسی دی گئی تھی۔ کرتار سنگھ سرابا کا شہر بھی یہی تھا جو ہندوستان کی آزادی کی جنگ لڑتا رہا اور اسے بھی پھانسی کی سزا ہوئی۔ اُس وقت اس کی عمر انیس سال تھی۔ سنیل متل، جو کہ ایک مشہور بھارتی صنعتکار ہیں کا تعلق بھی اسی شہر سے ہے۔

لدھیانہ کا ذکر آئے تو ساحر لدھیانوی کو کون بھول سکتا ہے۔ ان کی پرورش بھی اسی شہر میں ہوئی۔ مجلس احرار کے بانی مولانا حبیب الرحمان لدھیانوی بھی اسی شہر کے باسی تھے۔ اگر آپ کا فیصل آباد جانا ہو تو آپ نے صوفی برکت علی صاحب، دارالاحسان والے کا نام تو ضرور سنا ہوگا۔ وہ بھی اسے شہر میں پیدا ہوئے۔ مشہور فلم ایکٹر طالش اور ایک مایہ ناز ادیب سعادت حسن منٹو بھی اسی شہر سے تعلق رکھتے تھے۔

چنڈی گڑھ کا ذکر کرتے ہوئے میں نے ذاکر حسین روز گارڈن کا ایک مختصر تعارف آپ کے سامنے پیش کیا تھا۔ اسی طرح کا ایک نہرو روز گارڈن بھی لدھیانہ میں بنایا گیا ہے۔ یہ باغ 1967ء میں بنایا گیا جو 127 ایکڑ پر محیط ہے۔ اس میں سترہ ہزار کے قریب گلاب کے پودے ہیں جو گلاب کی 1،600 اقسام پر مشتمل ہیں۔ ۔ اسے بہت ہی خوبصورت طریقے سے سجایا گیا ہے۔ یہ اس وقت لدھیانہ کی سب سے بڑی تفریح گاہ ہے۔ اس کے ساتھ ہی ایک چھوٹا سا چڑیا گھر بھی بنایا گیا ہے۔ یہاں پر ہر سال گلاب میلے کے نام سے ایک بہت بڑا ثقافتی شو بھی منعقد کیا جاتا ہے جس میں ہزاروں لوگ شریک ہوتے ہیں۔

لدھیانہ میں 1999ء جی ٹی روڈ کے ساتھ مہاراجہ رنجیت سنگھ وار میوزیم بنایا گیا۔ اس میوزیم میں سکندر کے دور میں ہونے والی جنگوں سے کارگل کی جنگ تک کی بہت سی چیزیں رکھی گئیں ہیں۔ یہ چار ایکڑ پر پھیلا ہوا ایک بہت بڑا میوزیم ہے۔ جیسے ہی آپ اس میں داخل ہوتے ہیں تو سب سے پہلے آپ کو مہاراجہ رنجیت سنگھ کا ایک بڑا بت ملتا ہے۔ پاکستان کے ساتھ ہونے والی تین بڑی جنگوں 1965 ,1948، 1971ء کے دور کی چیزیں بھی یہاں پر رکھی ہوئی ہیں۔ یہ بھی لدھیانہ کا ایک مشہور تفریحی مقام ہے۔ لدھیانہ میں لودھیوں کا بنایا ہوا ایک قلعہ بھی موجود ہے جس کا پرانا نام تو لودھی قلعہ تھا لیکن اب لوگ اسے پرانا قلعہ کے نام سے ہی جانتے ہیں۔ اس کی عمارت کو دیکھ کر کہا جا سکتا ہے کہ

"کھنڈر بتا رہے ہیں عمارت تو خوب ہو گی"

یہ پانچ سو سال پرانا قلعہ ہے جسے سکندر لودھی نے بنوایا تھا اور اس کا بنیادی مقصد مغرب سے آنے والے حملہ آوروں کو روکنا تھا۔ اس کی فوج کا ایک بڑا حصہ یہیں رہتا تھا۔ اس کی جغرافیائی حیثیت کی وجہ سے رنجیت سنگھ نے بھی اسے اپنے پاس رکھا اور

بعد میں ایک معاہدے کے تحت جب انگریزوں نے لدھیانہ کو اپنے کنٹرول میں لیا تو یہ قلعہ بھی ان کے پاس چلا گیا۔ یہ ایک تاریخی قلعہ ہے لیکن تازہ اطلاعات کے مطابق اس کی حالت بہت اچھی نہیں ہے۔ جس سے لگتا ہے کہ یہ اب تک نظرانداز کیا جانے والا قلعہ ہی ہے۔

لدھیانہ میں کمال الدین خان کے نام سے منسوب ایک مسجد بھی ہے جسے عام طور پر بلوان والی مسجد کہا جاتا ہے. تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ یہ مسجد جہانگیر کے دور میں بنائی گئی تھی۔ یہاں پر بہت سے کمرے بھی اور ایک طویل برآمدہ بھی موجود ہے۔ اس کی عمارت کا حسن اور خوبصورتی انسان کو مسحور کر دیتی ہیں۔ یہ مغل طرز تعمیر کا ایک شاہکار ہے۔ یہ مسجد ایک وسیع رقبے پر پھیلی ہوئی ہے جبکہ مسلمانوں کی آبادی یہاں پر نہ ہونے کے برابر ہے۔ اس وجہ سے مسجد میں ایک خاموشی چھائی رہتی ہے۔ کچھ لوگوں کے نزدیک یہی خاموشی اس جگہ کا حسن بھی ہے

میں نے حال ہی میں کئی ایسی ویڈیوز دیکھیں ہیں جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ لدھیانہ کے قریب ایک گاؤں میں، جہاں کبھی مسلمان بستے تھے، ایک بڑی مسجد بھی تھی۔ مسلمان تو چلے گئے لیکن گاؤں والے، جن میں ہندو اور سکھ دونوں شامل ہیں، اب تک مسجد کی دیکھ بھال کر رہے ہیں۔

یہ اللہ کا گھر تھا اسے کون مٹا سکتا تھا۔ وہ اپنے گھر کی حفاظت کس سے کرواتا ہے، یہ اس کی مرضی ہے۔

لدھیانہ کہ سحر سے نکل کر ہم سرہند کی طرف رواں دواں تھے۔ ہم نے بچوں کو تسلی دی کہ ساٹھ کلومیٹر کے بعد سرہند شہر میں ہم کھانے کے لیے رکیں گے۔

جی ٹی روڈ پر لدھیانہ سے چالیس کلومیٹر کے فاصلے پر کھنہ شہر موجود ہے جو ایشیاء کی سب سے بڑی اناج منڈی ہے۔ ہمارے دائیں طرف مالیر کوٹلہ، احمد نگر اور سنگرور شہر موجود تھے جب کہ ہمارے بائیں طرف ماچھی واڑا اور چمکور صاحب جیسے دو بڑے قصبے آباد تھے۔ اس سے پہلے کہ میں آپ کو سرہند میں ایک منفرد ریستوران کے بارے میں کچھ بتاؤں میں چاہوں گا کہ اپنے ارد گرد واقع درج بالا اہم قصبات کا مختصر ذکر آپ کی خدمت میں پیش کروں۔

A beautiful building in Ludhiana Photo Credit:
https://www.tourmyindia.com

Abdul Kadir Jilani, visited by both Hindu and Muslim pilgrims Ludhiana Photo Credit:
https://www.tourmyindia.com

چمکور صاحب: گورو گوبند سنگھ اور وزیر خان کی جنگ

چمکور صاحب کو شری چمکور صاحب بھی کہا جاتا ہے۔ یہ ضلع روپ نگر میں واقع ایک چھوٹا سا قصبہ ہے۔ اس شہر میں ستر فیصد کے قریب سکھ، پچیس فیصد سے زائد ہندو اور تقریباً پانچ فیصد مسلمان بھی آباد ہیں۔ یہاں پر دو بڑی لڑائیاں لڑی گئیں تھیں۔ جن میں سے ایک لڑائی کا ذکر تفصیل سے ملتا ہے جس کی وجہ سے اس شہر کو ایک تاریخی اہمیت حاصل ہوئی۔ اس جنگ کے بارے میں سکھوں کی تاریخ میں بہت کچھ لکھا گیا ہے۔

گورو تیغ بہادر کے قتل کے بعد گرو گوبند سنگھ نے سکھ دھرم کی قیادت سنبھالی اور خالصہ فوج کی باقاعدہ بنیاد رکھی۔ انند پور کی ایک جنگ کے بعد گرو گوبند سنگھ ایک معاہدے کے تحت اس جگہ کو چھوڑ کر اپنے چالیس ساتھیوں اور دو بچوں کے ساتھ چمکور کے قریب روپ چند کی حویلی میں آ گئے۔ مغلیہ فوج، جس کی قیادت وزیر خان کر رہا تھا، نے اس جگہ کا گھیراؤ کر لیا۔

وہ جنگ کئی دن تک جاری رہی اور چالیس سکھ مارے گئے۔ اس جنگ میں گورو گوبند سنگھ کے دونوں بڑے بیٹے بھی مارے گئے۔ کسی طرح سے گرو گوبند صاحب بچ نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔ اس دوران ان کے دو چھوٹے بیٹوں کو وزیر خان نے گرفتار کر لیا جو اس وقت اپنی دادی کے پاس تھے۔ ان دونوں بچوں کو سرہند کے قریب ایک دیوار میں زندہ چنوا دیا گیا۔ اب اسی جگہ پر گردوارہ فتح گڑھ صاحب بنایا گیا ہے اور اسی وجہ سے اس علاقے کا نام فتح گڑھ صاحب رکھا گیا۔ اس کی تفصیلات میں پچھلے صفحات میں آپ کے سامنے پیش کر چکا ہوں۔ اس جنگ میں قتل ہونے والوں کی یاد میں، جنھیں وہ شہید کہتے ہیں ہر سال کئی پروگرام منعقد کیے جاتے ہیں۔ اسی جنگ کی وجہ سے چمکور قصبے کو شری چمکور صاحب کا نام دیا گیا ہے۔

Guru Gobind Singh accompanying Sahibzada
Ajit Singh & Jujhar Singh at Chamkaur War
Photo Credit: http://www.discoversikhism.com

چمکور صاحب کے پاس ایک مچھلی واڑا نامی قصبہ بھی موجود ہے۔ دریا کے بالکل پاس ہونے کی وجہ سے اسے مچھلی واڑا کہا جاتا ہے، یعنی ایسی جگہ جہاں مچھلی کا کاروبار ہوتا ہے۔ اب اسے عام طور پر ماچھی واڑا کہا جاتا ہے۔ چمکور صاحب سے بچ نکلنے کے بعد گرو گوبند سنگھ نے دو پٹھانوں کی مدد سے مچھلی واڑا کے جنگلات میں پناہ لی۔ جہاں پر انھوں نے پناہ لی وہیں پر گردوارہ بھی بن چکا ہے۔ اس سے پہلے مچھلی واڑا کی ایک اور تاریخ **بھی** ہے جس کا تعلق ہمایوں اور شیر شاہ سوری کے جانشینوں سے ہے۔

تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ جب ہمایوں نے شیر شاہ سوری کی وفات کے بعد اپنے تخت کی خاطر کوشش کی تو اس کا آغاز پنجاب کی طرف سے ہوا تھا۔ اس کے ساتھ بہت سے مغل حکمرانوں کے حمایتی بھی ان کے ہم رکاب تھے۔ ہمایوں نے دیپالپور، جالندھر اور کئی دیگر علاقے فتح کرنے کے بعد شیر شاہ سوری کے بیٹے سکندر شاہ سوری کی بھیجی ہوئی ایک بڑی فوج، جس کی قیادت نصیب خان اور تاتار خان کر رہے تھے، سے

مچھلی واڑا میں جنگ کی۔ وہ ایک فیصلہ کن جنگ تھی جس کے بعد ہمایوں نے سرہند پر قبضہ کیا اور یوں وہ دہلی پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔

احمد نگر: جو کبھی بہادر نگر تھا

جی ٹی روڈ کے دائیں طرف چند کلومیٹر کے فاصلے پر احمد نگر نامی ایک قصبہ نقشے میں دکھائی دیتا ہے۔ نام سے ہی پتہ چلتا ہے کہ کہ یہ کسی مسلمان کا بسایا ہوا شہر ہو گا۔ اس سے متعلق تو دو بڑی اہم باتوں کا پتہ چلا۔ ایک یہ کہ یہاں پر بیسویں صدی کے آغاز میں جب ریلوے لائن کا آغاز کیا گیا، ریلوے سٹیشن کے لیے جگہ درکار تھی۔ درکوٹ نام کے ایک خاندان نے اس وقت کے مالیر کوٹلہ کے نواب احمد علی خان سے زمین کا تبادلہ کیا اور زمین کا ایک ٹکڑا ریلوے سٹیشن بنانے کے لیے دے دیا۔ اس طرح اس جگہ کا نام، جو پہلے بہادر گڑھ تھا، بدل کر احمد نگر رکھ دیا گیا۔

اسی طرح کا ایک واقعہ ہمارے ہاں سندھ میں بھی پیش آیا تھا۔ آپ نے نواب شاہ کا نام تو سنا ہو گا۔ سید نواب شاہ علاقے کے ایک بڑے زمیندار تھے۔ جب انگریزوں نے اس علاقے میں ریل کی پٹڑی بچھائی تو انھیں ریلوے سٹیشن کے لیے جگہ کی ضرورت تھی۔ نواب شاہ صاحب نے اس کام کے لیے کئی ایکڑ جگہ دے دی۔ جس سے خوش ہو کر انگریزوں نے ریلوے سٹیشن کا نام نواب شاہ رکھ دیا۔

بعد ازاں وہاں پر ایک بڑا شہر بسا۔ اب شہر کا نام تو نوابشاہ ہے لیکن ضلع کا نام بے نظیر بھٹو کے نام پر بے نظیر آباد رکھ دیا گیا ہے۔

میں یہ سب جان کر اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ جو بھی چیز اللہ کے بندوں کے لیے بنائی جاتی ہے وہ تا دیر تک قائم رہتی ہے اور جو اپنی ذات تک محدود رہے وہ انسان کی موت کے ساتھ ہی ختم ہو جاتی ہے۔

احمد نگر کی دوسری اہم بات یہ ہے کہ اسے ایک منڈی کے طور پر پلان کیا گیا تھا۔ یہ ایک بہت ہی عمدہ مثال ہے کہ کس طریقے سے تقسیم ہند سے قبل انگریزوں نے منڈیاں قائم کیں تھیں۔ جب میں نے احمد نگر میں واقع غلہ منڈی کی تفصیل پڑھی تو وہ مجھے ایک فیصد بھی اپنے شہر، ٹوبہ ٹیک سنگھ کی غلہ منڈی سے مختلف نہیں لگی۔ اسی طرح سے چار دروازے، غلہ منڈی کی چوڑائی میں کم اور زیادہ لمبی دکانیں، منڈی کے چاروں طرف دیوار اور درمیان میں پانی کا بندوبست وغیرہ وغیرہ۔ اس کے علاوہ بھی میں نے پنجاب کے مختلف شہروں میں انگریزوں کی بنائی گئی غلہ منڈیوں کے نقشے دیکھے جو تقریبا ایک جیسے ہی تھے۔

احمد نگر غلہ منڈی، ٹوبہ ٹیک سنگھ غلہ منڈی سے ملتی جلتی نہیں بلکہ ایک جیسی ہی ہے جس سے متعلق جان کر مجھے بے حد خوشی ہوئی۔

مالیر کوٹلہ: جہاں تقسیم ہند کے وقت کسی مسلمان کا قتل نہیں ہوا، مسلم اکثریت کا شہر

لدھیانہ سے جنوب مشرق کی طرف ایک سڑک مالیر کوٹلہ اور سنگرور کی طرف جاتی ہے۔ مالیر کوٹلہ اس سڑک پر لدھیانہ سے تقریبا پچاس کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ جی ٹی روڈ سے اس کا فاصلہ تیس کلومیٹر کے قریب ہے۔ اس شہر کی آبادی ڈیرھ لاکھ کے قریب ہے۔

لاہور میں میرے ایسے کئی دوست ہیں جو ریاست مالیر کوٹلہ کے شاہی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں اور میں نے ان سے کئی بار مالیر کوٹلہ کے بارے میں گفتگو بھی کی۔ میرے دوست اویس ناصر خاں بھی انھی میں سے ایک ہیں جو ماڈل ٹاؤن میں رہتے ہیں۔ میں ان کے والد صاحب سے بھی ملا ہوں۔ جنھیں نواب صاحب ہی کہہ کر پکارا جاتا تھا۔

جب میں نے مالیر کوٹلہ کے بارے میں پڑھا تو مجھے ایک ایسی بات کا پتہ چلا جس کا ذکر کسی کتاب میں نہیں ملتا۔ تاریخ سے یہ بھی جاننے کو ملتا ہے کہ مالیر کوٹلہ پنجاب کا وہ شہر ہے جہاں تقسیم ہند کے وقت کسی ایک مسلمان کا بھی قتل نہیں ہوا اور نہ ہی مسلمانوں کی بڑی تعداد نے یہاں سے ہجرت کی۔ یہ اس علاقے کا وہ واحد شہر ہے جہاں آج بھی مسلمانوں کی آبادی ستر فیصد سے زائد ہے۔ اس کے راجا نے بھی مالیر کوٹلہ میں ہی رہنا پسند کیا۔ آخر ایسا کیوں ہوا جب کہ اس علاقے کے کسی شہر میں بھی مسلمانوں کی آبادی ایک یا دو فیصد سے زائد نہیں ہے۔ کوئی تو ایسی بات ہو گی جس کی وجہ سے اس علاقے میں تقسیم پنجاب کے وقت یہ انوکھا واقعہ پیش آیا۔

میں آپ کے سامنے اس ریاست کی مختصر تاریخ اور ایک تاریخی واقعہ کی تفصیل پیش کرنا چاہتا ہوں، جس سے آپ خود اندازہ کر سکیں گے کہ ایسا کیسے ہوا۔

تاریخ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ افغانستان سے آئے ہوئے شیر وانی قبیلے کے لوگوں نے سترہویں صدی میں ریاست مالیر کوٹلہ کی بنیاد رکھی جس کا صدر مقام مالیر کوٹلہ تھا اور اس کے حکمران نواب کہلاتے تھے۔ مغل حکمران کسی کو بادشاہ کہلوانے کی اجازت نہیں دیتے تھے انھیں راجا یا نواب کا لقب ہی دیا جاتا تھا۔

سترہویں صدی میں شیر محمد خان بہادر اس ریاست کے پہلے جب کے نواب احمد علی خان آخری نواب تھے۔ تقسیم کے بعد چند ماہ کے لیے نواب افتخار علی خان کو بھی نواب بنایا گیا۔ تاریخی طور پر یہ ریاست 1657ء میں جب شاہ جہاں کا دور تھا، میں قائم اور 1948ء کو ختم ہوئی۔ یہ ریاست تقریباً تین سو سال تک قائم رہی۔ یہ ریاست بھی باقی ریاستوں کی طرح انگریزوں کی ایک طفیلی ریاست تھی۔ نوابین نے تو بھارت میں ہی رہنا پسند کیا البتہ ان کے خاندان کے بہت سے لوگ پاکستان آ گئے۔

مقامی روایت کے مطابق یہ کہا جاتا ہے کہ بہلول لودھی پندرہویں صدی کے وسط میں دہلی پر حکومت کرنا چاہتا تھا۔ وہ دہلی پر حملہ کرنے کے لیے جا رہا تھا کہ موسم خراب ہونے کی وجہ سے اس کے قافلے کو کافی نقصان پہنچا۔ اسے دور کسی جھوپڑی میں کسی دیئے کی روشنی دیکھائی دی اور وہ وہاں چلا گیا۔ اس جھونپڑی میں اسے شیخ صدرالدین ملے. شیخ صدر دین ایک نیک اور پارسا شخص تھے۔ بہلول لودھی نے ان سے کہا اس کے لیے دعا کریں کہ اسے جنگ میں فتح حاصل ہو۔ دہلی کی اس جنگ میں بہلول لودھی کو فتح حاصل ہوئی۔ اس نے اس خوشی میں اپنی بیٹی کی شادی شیخ صدرالدین سے کر دی اور مالیر کوٹلہ میں ایک بڑی جاگیر بھی عطا کی۔ شیخ صدرالدین کی اولاد میں سے کچھ لوگوں نے ریاست کی ذمہ داری سنبھالی اور کچھ لوگوں نے صدرالدین کے مزار کی۔

تاریخ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ سترہویں صدی کے وسط میں یہاں کے ایک نواب نے اورنگزیب کی شیر کے شکار کے موقع پر جان بچائی تھی۔ جس سے خوش ہو کر اورنگزیب نے اسے ایک جاگیر دی اور یہاں پر ایک قلعہ بھی بنوایا۔ میں نے اس بات کی کافی کوشش کی کہ معلوم ہو سکے کہ مالیر کوٹلہ کا نام مالیر کوٹلہ کیوں رکھا گیا؟ لیکن مجھے کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ مغلوں کی حکومت ختم ہونے کے بعد یہ علاقہ انگریزوں کے قبضے میں چلا گیا۔

تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ تقسیم پنجاب کے وقت جب پورا پنجاب جل رہا تھا، مسلمانوں کے خون کی ہولی کھیلی جاری تھی، ہر طرف قتل و غارت اور لوٹ مار کا بازار گرم تھا اور ایسے حالات میں مالیر کوٹلہ میں کسی بھی مسلمان کو خراش تک نہ آئی اور سب لوگ محفوظ رہے یہ انتہائی حیرانی کی بات ہے کہ چاروں طرف آگ لگی ہو اور ایک شہر، جو ان کے بیچ میں آباد تھا، کیسے محفوظ رہا؟ یقیناً اس کی بھی کوئی خاص وجہ ہی ہو گی۔ اس لیے اس کا جاننا بھی ضروری ہے۔

میں نے پچھلے صفحات میں آپ سے اس بات کا ذکر کیا تھا کہ گورو گوبند سنگھ ، جن کے نام پر میرے شہر ٹوبہ ٹیک سنگھ میں ایک محلّہ گوبند پورہ آج بھی موجود ہے، کے دو بیٹوں ، صاحبزادہ فتح سنگھ اور صاحبزادہ زوروار سنگھ ، کو اورنگزیب کے گورنر وزیر خان نے دیوار میں زندہ چنوا دیا تھا۔ کہتے ہیں کہ جب وزیر خان نے یہ فیصلہ کیا اس وقت مالیر کوٹلہ کے نواب شیر محمد خان ، جو وزیر خان کے رشتہ دار بھی تھے ، نے اس کے خلاف بہت احتجاج کیا اور اسے کہا کہ یہ انسانیت اور اسلام کے خلاف ہے لیکن وزیر خان نہ مانا۔ نواب شیر محمد خان وہاں سے چلے گئے اور اس واقعہ کے خلاف آواز بلند کی۔ انھوں نے وزیر خان سے یہ بھی کہا کہ بچوں کا کوئی قصور نہیں ہے۔ آپ یہ بچے میرے حوالے کر دیں میں ان کی پرورش کروں گا۔ نواب نے اورنگزیب عالمگیر کو اس کے بارے میں خط بھی لکھا تھا۔

لیکن سب بے سود ثابت ہوا۔

سکھوں کی تاریخ میں یہ بھی بات لکھی ہوئی ہے کہ جب گورو کو اس پورے واقعے کا پتہ چلا تو اس نے لوگوں سے پوچھا کہ کیا کسی نے اس واقعے پر احتجاج بھی کیا تھا؟ لوگوں نے بتایا کہ مالیر کوٹلہ کے نواب نے اس پر سخت احتجاج کیا تھا اور نعرہ حق بلند کیا تھا۔ اس واقعے کو نعرہ حق بلند کرنے کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس بات سے خوش ہو کر گورو نے ایک حکم نامہ جاری کیا اور اپنی کرپان بھی نواب مالیر کوٹلہ شیر محمد خان کو دے دی۔

یہی وہ وجہ تھی کہ جب تقسیم پنجاب ہوئی تو اس شہر کے سکھوں نے مسلمانوں کی حفاظت کی اور کسی کو بھی ہجرت پر مجبور نہیں کیا نہ کوئی لوٹ مار ہوئی، نہ کوئی اغوا ہوا اور نہ ہی کوئی قتل ہوا۔ اگر کوئی پاکستان آیا تو وہ اپنی مرضی سے ہی آیا۔ چند سال قبل ہونے والی مردم شماری سے پتہ چلتا ہے کہ اس شہر میں ستّر فیصد مسلمان بیس فیصد ہندو جبکہ سکھ دس فیصد سکھ آباد ہیں۔

مجھے یہ جان کر بھی خوشی ہوئی کہ اس شہر میں جہاں پنجابی میں تعلیم دی جاتی ہے، وہیں اردو میں بھی تعلیم دی جاتی ہے اور اس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ اردو مسلمانوں کی زبان ہے اور وہ یہاں ایک بڑی تعداد میں رہتے ہیں۔

Photo Credit: https://www.facebook.com/BaruSahibHP
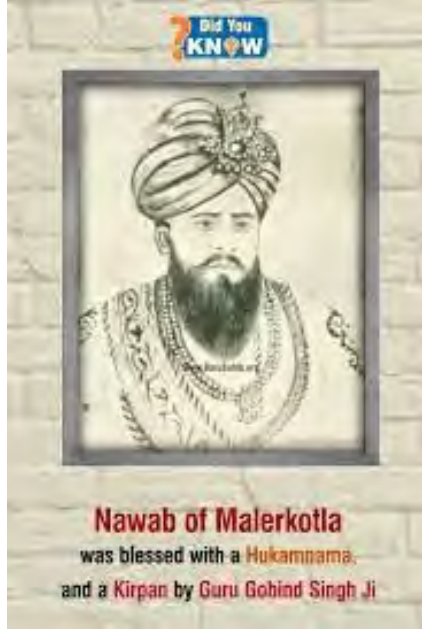
جس نواب نے گرو گوبند سنگھ کے بچوں کو بچانے کی کوشش کی، اس کے نام پر یہاں نواب شیر محمد خان انسٹی ٹیوٹ آف ایڈوانسڈ سٹڈیز بھی بنایا گیا ہے۔

یہ وہی مالیر کوٹلہ ہے جس کے نواب کا احسان ہمارے خاندان پر بھی ہے۔

میں نے اپنے خاندان کے ایک بزرگ سے ان کے اجڑنے کی داستان سنی اور اس کی وڈیو بنا کر سوشل میڈیا پر بھی رکھی ہے۔ انھوں نے مجھے بتایا تھا کہ جب ان کے بڑوں کو شہید کر دیا گیا تو ایک قریبی گاؤں کے سکھ زمیندار نے ہم تمام بچوں کو اکٹھا کر کے اپنے

پاس حفاظت سے رکھا۔ بعد ازاں ان تمام بچوں کو مالیر کوٹلہ کے نواب کے حوالے کر دیا۔ جنھوں نے ایک ریل گاڑی کا بندوبست کر کے ان تمام بچوں کو بحفاظت پاکستان پہنچایا۔

ایسا بھی ہوا ہے۔۔۔ جس کا ذکر کہیں نہیں ملتا، شاید اس کا ذکر ہمارے قومی بیانیے کے خلاف ہو گا۔۔۔ تبھی اس طرح کی باتوں کو نہیں بتایا جاتا!

The Canons at Malerkotla Photo Credit:

https://malerkotla.punjabonline.in

Eid Gah Malerkotla Photo Credit:
https://malerkotla.punjabonline.in

کھنہ : ایشیاء میں اناج کی ایک بڑی مارکیٹ

اب ہم سرہند پہنچنے والے تھے اور دن کا ایک بج رہا تھا۔ بچے اکتاہٹ کا مظاہرہ کر رہے تھے، میری اور عرفان صاحب کی باتیں بھی ختم ہو رہی تھیں۔سب کا خیال تھا کہ جتنی جلدی ہوسکے ہم کسی ریستوران میں پہنچیں۔ اس سے پہلے کہ میں آپ کو انتہائی منفرد ریستوران، جو کہ سرہند میں واقع ہے، کے بارے میں کچھ بتاؤں میں چاہوں گا کہ راستے میں آنے والے کھنہ نامی قصبے ، جو کہ ایشیاء میں اناج کی سب سے بڑی مارکیٹ مانی جاتی ہے، کا ایک مختصر احوال بھی آپ کی خدمت میں پیش کروں۔

اردو اور پنجابی میں بھی "خانہ کا لفظ حصہ" کے لیے استعمال ہوتا ہے، مثلا چار خانے یعنی چار حصے وغیرہ۔ یہ لفظ ذرا بدل کر "کھنہ" پنجابی میں چوتھائی حصے کے لیے بولا جاتا ہے۔اب تو یہ لفظ عام نہیں لیکن مجھے یاد ہے کہ میرے بچپن میں ہم ایک دوسرے سے روٹی مانگتے ہوئے دو ہی لفظ استعمال کرتے تھے، چپہ روٹی، یعنی روٹی کا آٹھواں حصہ اور کھنہ روٹی، جس سے مراد چوتھا حصہ ہوتا تھا۔اس شہر کا نام بھی اسی طرح سے ، یعنی چوتھا حصہ رکھا گیا ہے۔

اس نام کی تفصیل کافی دلچسپ ہے۔کہتے ہیں کہ یہاں کے ایک سردار نے اپنی بیٹی دیا کور کی شادی نابھہ کے راجا کے ساتھ کردی۔ بعد ازاں میاں بیوی میں اختلاف پیدا ہوگئے جس کی وجہ سے وہ لڑکی اپنے والدین کے گھر واپس آ گئی۔ اس کا والدین کے گھر رہنا معاشرتی طور طریقوں کے خلاف تھا۔ جس پر اس کے والد نے اپنی جائیداد کا چوتھا حصہ اپنی بیٹی کے نام کر دیا اور اس جگہ جہاں بیٹی نے اپنی رہائش وغیرہ رکھی کو کھنہ کے نام سے جانا جانے لگا۔

یہ شہر جی ٹی روڈ پر سرہند سے بیس اور لدھیانہ سے چالیس کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ اس کی آبادی ڈیڑھ لاکھ کے قریب ہے۔ اسی علاقے میں شیر شاہ سوری نے ایک سرائے بھی بنائی تھی۔ اس شہر میں شرح خواندگی نوے فیصد کے قریب ہے. اور یہاں ہندوؤں کی اکثریت ہے جبکہ مسلمان آبادی کا دو فیصد ہیں۔

اس شہر سے گزرتے ہوئے مجھے یہ بھی یاد آیا کہ میرے آباؤاجداد اپنی فصل اسی شہر میں بیچنے کے لیے لاتے تھے۔

ان کے بیلوں کی گھنٹیاں اور ان کے قدموں کی چاپ میرے کانوں میں گونج رہی تھی۔۔۔۔ میں تصور ہی تصور میں ساٹھ سال پیچھے چلا گیا!

سرہند نہر کے درمیان پانی پر بنایا گیا فلوٹنگ ریستوران

اس پورے سفر میں ہماری بس سے آگے ایک گاڑی میں پولیس کے لوگ سوار ہوتے تھے۔ پولیس والے ہوٹر کا بھی استعمال کرتے تھے اور اکثر جگہوں پر سگنلز بند کروا کر ہماری بس کو گزارا جاتا تھا۔ ایسا تو شاید وہ لوگ انگریزوں کے لیے بھی نہ کرتے ہوں۔ یہ خصوصی سلوک صرف پاکستان سے آنے والی بس کے ساتھ ہی کیا جاتا تھا۔ ایسا ہی سلوک پاکستان میں بھارت سے آنے والی بس کے ساتھ کیا بھی جاتا تھا۔ ہم تقریباً ایک بجے کے بعد سرہند پہنچے۔ اس سے پہلے بھی میں 2000ء میں سرہند آچکا تھا۔

سرہند کے ساتھ میری جذباتی وابستگی کی وجہ بہت ہی واضح ہے۔ میرے آباؤ اجداد کا تعلق اسی شہر سے تھا۔ اس کا ذکر میں اپنے پچھلے سفر نامے (حصہ سوئم) میں کر چکا ہوں۔ ہماری بس سرہند نہر کے پاس رکی۔ ہم ارد گرد کسی ریستوران کی تلاش میں تھے۔ ہماری حیرانی کو بھانپتے ہوئے پولیس کے ایک آفیسر نے کہا کہ یہاں پر ایک بہت ہی منفرد ریستوران ہے جو نہر کے درمیان میں بہت سے خالی ڈرم رکھ کر ان کے اوپر بنایا گیا ہے۔ ہم اسے فلوٹنگ ریستوران کہتے ہیں۔

Floating Restaurant Sirhnad
Photo Credit: https://worldarchitecture.org/architecture-news/cvvvh/india

جب ہم نے اسے دیکھا تو پتہ چلا کہ واقعی نہر کے اندر بہت سے خالی ڈرم رکھ کر اوران کے اوپر لکڑی کے تختے جوڑ کر وہ ریستوران بنایا گیا ہے اور نہر کے دونوں طرف سے اس میں جایا جاسکتا ہے۔ پہلی نظر میں وہ سب بہت ہی حیران کن لگا۔ وہ نہر چھ میٹر گہری اور پینتالیس میٹر چوڑی تھی۔ عام طور پر ہماری نہریں دو سے تین میٹر گہری ہوتی ہیں۔ اس کی اتنی گہرائی کی وجہ سے ہی یہاں پر یہ ریستوران بن سکا۔ ہم اس ریستوران میں چلے گئے اور مختلف میزوں پر بیٹھ گئے۔ نیچے پانی چلتا ہوا نظر آرہا تھا اور پورا فرش ہلکے ہلکے ہچکولے بھی کھا رہا تھا۔ وہ فرش لکڑی کا بنا ہوا تھا۔ کہیں کہیں فرش میں شیشہ بھی لگا ہوا تھا جس سے ہم نیچے بہتے پانی کو دیکھ سکتے تھے۔ بھارت بھر میں یہ وہ اپنی طرز کا پہلا ریستوران تھا۔ اسے دہلی اور امرتسر کے درمیان سفر کرنے والے مسافروں کے لیے ایک اہم جگہ سمجھا جاتا ہے۔

اس کا ڈیزائن جیت ملہوترا اور راجندر سنگھ نے تیار کیا۔ ہمیں یہ بھی بتایا گیا کہ اس نہر پر دو کلومیٹر کے علاقے میں تیس سے زائد فلوٹنگ ہٹ بنائے گئے ہیں۔ یہ بات بھی

دلچسپی سے خالی نہیں ہے کہ اس ریستوران کی بجلی کی ضروریات پوری کرنے کے لیے اسی ریستوران کے ساتھ ہی ایک چھوٹا سا بجلی گھر بھی بنایا گیا ہے۔ جہاں پانی کی مدد سے بجلی بنائی جاتی ہے۔

میرے بڑے جب بھی اپنے دیس کی بات کرتے تھے تو وہ سرہند نہر کا ذکر بھی ضرور کرتے تھے۔ میں نے اس سے متعلق جاننا چاہا تو پتہ چلا کہ یہ بھارت کی سب سے بڑی اور سب سے پرانی نہر رہے جو دریائے ستلج پر روپڑ کے مقام سے نکالی گئی ہے۔ روپڑ ایک قدیم شہر ہے جس کی تاریخ پانچ ہزار سال پرانی ہے۔ لدھیانہ کے پاس آ کر یہ نہر تین حصوں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ جس کا ایک حصہ پٹیالہ کی طرف جاتا ہے اور اسی پر یہ فلوٹنگ ریستوران بنا ہوا ہے۔

اس نہر کو بنانے کیلیے تین ریاستوں نے مل کر وسائل مہیا کیے تھے۔ ان میں ریاست پٹیالہ، ریاست جند اور ریاست نابھہ شامل ہیں۔ اس نہر کی منصوبہ بندی 1867ء میں کی گئی اور اس کا افتتاح 1882ء میں کیا گیا۔ اس کی لمبائی تقریباً ڈھائی سو کلومیٹر ہے۔ فیروز پور کے قریب آ کر یہ نہر دوبارہ دریائے ستلج میں مل جاتی ہے۔ دریا سے ملانے کا مقصد یہ ہے کہ سیلاب کی صورت میں فالتو پانی ستلج دریا میں ڈالا جا سکے۔ سیلاب سے بچنے کا یہ ایک خوبصورت اور قابلِ عمل طریقہ ہے

سرہند نہر کے بارے میں یہ بات بھی کہی جاتی ہے کہ اگر یہ نہ بنائی جاتی تو شاید پنجاب اتنا خوشحال نہ ہوتا۔ یہ مشرقی پنجاب کے ایک بہت بڑے علاقے کو سیراب کرتی ہے۔ میرے بزرگ بتاتے تھے کہ اس وقت کھدائی کے لیے کئی علاقوں سے ہزاروں مزدوروں کو لایا گیا تھا جنھوں نے نہر کی کھدائی کی تھی۔ اس وقت مشینوں سے کھدائی کی سہولت میسر نہ تھی۔

میں نے اپنے بزرگوں سے یہ بھی پوچھا تھا کہ کیا ہماری زمین بھی اسی نہر سے سیراب ہوتی تھی؟ان کا کہنا تھا کہ ہمارے علاقے میں زمینی پانی اچھا تھا اسی لیے اس نہر کا پانی ہمیں نہیں دیا گیا۔ ہم بیلوں کی مدد سے زمین سے پانی نکالتے تھے۔ وہ پانی سرہند سے آگے ان علاقوں تک پہنچایا گیا تھا جہاں زمینی پانی زراعت کے قابل نہیں تھا۔

آج میں اس نہر کو دیکھ رہا تھا جس کا ذکر میرے بزرگ کیا کرتے تھے۔ اگر آج وہ ساتھ ہوتے تو بات ہی کچھ اور ہوتی!

کھانا بھی بہت خوب تھا۔ ہمارا یہاں پر قیام تقریباً ایک گھنٹے کا تھا۔اس دوران ایک مقامی تھانے دار صاحب سے میری دوستی ہو گئی۔ ان کا نام انسپکٹر مہندر سنگھ تھا۔ وہ سرہند ہی کے رہنے والے تھے۔ میرا اور ان کی پنجابی زبان کا لہجہ بھی ایک جیسا ہی تھا۔ میں نے جب انھیں بتایا کہ میرے آباؤاجداد کا تعلق بھی اسی شہر سے تھا تو ہماری دوستی ہونے میں زیادہ وقت نہیں لگا۔ اس سفر کے بعد بھی ان سے خط وکتابت رہی۔ اور وہ سلسلہ کئی سال تک چلتا رہا۔

ان کے پاس بھی وقت تھا اور ہم بھی کھانے سے فارغ ہو چکے تھے۔ مجھے ان کی باتوں سے یہ محسوس ہوا کہ انھیں پڑھنے لکھنے کا بھی شوق ہے اور تاریخ سے بھی اچھی دلچسپی ہیں۔ میں نے اس وقت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ان سے کچھ بات چیت کی جس کا تعلق سکھوں اور مغلیہ سلطنت کے حکمرانوں کے درمیان تعلقات سے تھا۔

میں نے ان سے بہت سے سوالات کیے۔ انھوں نے اس کے جوابات بھی خوب دیئے۔ اس گفتگو کا ایک مختصر احوال آپ کی خدمت میں پیش ہے۔

باباگورونانک صاحب: سکھ دھرم کے بانی

میں نے سردار مہندر سے کہا کہ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ سکھوں اور مغلوں کے درمیان اختلافات کب پیدا ہوئے اور اس کی وجہ کیا تھی؟ اس میں نقصان کس کا ہوا؟ کیا

ان اختلافات کا تقسیم پنجاب کے وقت قتل و غارت میں بھی حصہ تھا؟اس کے علاوہ میں یہ بھی جاننا چاہتا ہوں کہ کیا یہ مذہبی جنگ تھی یا سیاسی جنگ تھی؟اس کے ساتھ ساتھ میری خواہش ہے کہ میں یہ بھی جان سکوں کہ اس لڑائی میں ہندو کس کا ساتھ دے رہے تھے اور کیا عام مسلمان بھی سکھوں کے خلاف تھے یا صرف وہ لڑائی مغل بادشاہ اور سکھوں کے گوروکے درمیان ہی تھی؟ میں نے بے تکلفی سے اور پنجاب پولیس کی وردی کی پرواہ نہ کرتے ہوئے انھیں مہندر جی کہنا شروع کر دیا۔

میری یہ ساری باتیں سن کر مہندر جی نے کہا کہ آپ کے سوال کافی زیادہ ہیں اور ہمارے پاس وقت بھی ہے۔ میں ان سوالات کے جواب جانتا ہوں اس لیے مجھے سوالات کے جواب دینے میں کوئی دقت نہیں ہو گی۔البتہ سوالات کی ترتیب میں اپنی مرضی سے ضرور درست کروں گا۔ میں نے کہا جی مجھے کوئی اعتراض نہیں پہلے سوال کا جواب آخر میں بھی دے دیں، مجھے تو جواب چاہیے۔

اس معاہدے کے بعد ایک اور معاہدہ بھی طے پایا کہ میں سوال تو کروں گا لیکن بحث نہیں کروں گا۔ کیونکہ بحث کا نتیجہ اچھا نہیں نکلتا، ہر آدمی ایک خاص سوچ کا حامل ہوتا ہے۔ وہ سامنے والے شخص کے سوال کا جواب دینے کی بجائے اپنے جواب کے حق میں دلائل دینا شروع کر دیتا ہے۔اس طرح سے گفتگو کا سلسلہ آگے نہیں بڑھتا۔ مہندر جی پولیس میں تھے اور وردی میں بھی تھے اس لیے ریستوران والے اور باقی لوگ بھی ان کی خدمت میں مصروف تھے۔ میری فرمائش پر ہم ایک جگہ بیٹھ گئے۔ سامنے نہر تھی، میز پر چائے تھی، منظر بھی بہت خوب تھا اور سرہند کا قصبہ بھی آنکھوں کے سامنے تھا۔۔۔

وہ منظر اب تک مجھے یاد ہے۔۔۔ ایک افسوس بھی تھا کہ میں سرہند کے پاس سے گزر رہا ہوں ۔۔۔ لیکن اپنے گھر نہیں جا سکتا۔۔۔ کیونکہ۔۔۔ درمیان میں ایک

نفرت اور خوف کی دیوار کھڑی ہے جس میں کوئی کھڑکی بھی نہیں ہے، کوئی دروازہ بھی نہیں ہے، کوئی روشندان بھی نہیں ہے۔۔۔ جس سے میں آنکھ لگا کر اپنے بزرگوں کے دیس کی ایک جھلک ہی دیکھ سکتا۔ ایسا نہ ہو سکا، کب تک ایک سوراخ کے بغیر دیوار قائم رہ سکتی ہے، کبھی تو ختم ہو گی، جب لوگ ادھر سے ادھر آ جا سکیں گے۔

ایک شخص تو میسر تھا جو اسی شہر کا رہنے والا تھا جہاں میرے والد اور والدہ نے جنم لیا تھا۔ ذرا ترمیم کے ساتھ

"توں نئیں تیرے شہر دی ہواواں ہی سہی"

میں بہت سارے سوالات ذہن میں لے کر بیٹھ گیا اور ایک کاغذ پنسل بھی ساتھ رکھ لیا تاکہ اہم باتیں نوٹ کر سکوں۔ مجھے یاد ہے کہ مجھے کچھ بھی نوٹ نہیں کرنا پڑا۔ مہندر جی نے ایک کہانی کی شکل میں تمام جوابات دیے وہی کہانی میں آپ کے سامنے بھی پیش کر رہا ہوں۔

مہندر جی نے بات کا آغاز سکھ دھرم کی تاریخ بتانے سے کیا۔ انھوں نے بتایا کہ سکھ دھرم کا آغاز شمالی ہندوستان کے علاقے پنجاب سے ہوتا ہے۔ اس کے بانی گرو نانک صاحب ہیں جو 1469ء میں ننکانہ صاحب میں پیدا ہوئے اور نارووال کے پاس کرتار پور میں 1539ء میں وفات پائی۔ بابا گورو نانک صاحب کو بابا گرو نانک دیو جی بھی کہا جاتا ہے۔ بابا گرو نانک صاحب کے والد صاحب کا نام کلیان چند داس بیدی تھا انھیں مہتا کالو کے نام سے بھی جانا جاتا ہے وہ ایک کھتری ہندو خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ کاروبار بھی کرتے اور ساتھ ہی پٹواری کا کام بھی سر انجام دیتے تھے۔

ان کے بعد نو گورو اور بھی ہیں۔ آخری گورو گورو گوبند سنگھ ہیں۔ جو سترہویں صدی کے آخر میں پیدا ہوئے اور اٹھارویں صدی کے شروع میں وفات پا گئے۔ ہماری مذہبی کتاب کا نام گرنتھ صاحب ہے جسے ہم ایک زندہ گورو سمجھتے ہیں۔

میں نے پوچھا کہ بابا گورو نانک صاحب کون تھے اور انھیں ایک نئے دھرم کا خیال کیسے آیا؟

مہندر جی کہنے لگے کہ بابا گورو نانک صاحب کی پیدائش کے وقت ہی بہت سے ایسے واقعات کا ذکر کیا گیا ہے جس سے کچھ ایسے اشارے ملنا شروع ہو گئے تھے جس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کوئی بڑی شخصیت بننے جا رہے ہیں۔ ان کے والد نے ان کی ابتدائی تعلیم کے لیے انھیں ایک مقامی درسگاہ میں داخل کروایا۔ جہاں پر انھوں نے اپنی ذہانت اور کئی ایسے معاملات سے اپنے اساتذہ کو متاثر کیا جن کا ذکر کتابوں میں ملتا ہے۔ ان کی بڑی بہن نانکی جی کی شادی سلطان پور لودھی سے ہوئی۔ بابا جی بھی کچھ عرصے بعد اپنی بہن کے پاس سلطان پور لودھی ہی آ گئے۔ یہاں پر ان کے بہنوئی جے رام، سلاطین دہلی کے گورنر دولت خان کے ملازم تھے، بابا گرو نانک صاحب بھی ان کے ملازم ہو گئے۔ بابا گرو نانک جی چودہ سال سے زائد عرصے تک سلطان پور لودھی میں رہے۔ ان کی شادی بٹالہ میں رہنے والے خاندان میں ہوئی اور ان سے ان کے دو بچے بھی پیدا ہوئے۔ انھوں نے اپنے کسی بھی بیٹے کو اپنا نائب نہیں بنایا اور نہ ہی ان کے خاندان کا کوئی فرد گورو بنا۔ اس دوران انھوں نے گیان کرنا بھی شروع کر دیا۔ اس کام کے لیے وہ ایک قریبی ندی تک جاتے تھے اور کئی کئی دن تک وہاں رہتے تھے اور خاموشی سے بہت کچھ سوچتے رہتے تھے۔ پھر وہ وقت آیا کہ انھوں نے کہنا شروع کر دیا کہ نہ کوئی ہندو نہ کوئی مسلمان۔ یاد رہے وہ خود ایک ہندو خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ انھوں نے بہت سی مختلف باتیں بھی کہنا شروع کیں جو عقل و دانش سے بھری ہوئی تھیں اور ان سب میں انسانیت کا درس تھا۔ سب سے اہم بات ایک خدا کا پرچار تھا اور بت اور مورتی کی پوجا سے منع کیا جانا تھا۔ میں اس پر بات آگے چل کر تفصیل سے بات کروں گا، مہندر جی نے کہا۔

مہندر جی نے بتایا کہ 1500ء میں وہ طویل سفروں پر نکل گئے۔ وہ چوبیس سال کے عرصے میں نیپال سے موجودہ ہندوستان، پاکستان، افغانستان و سطی ایشیائی ریاستوں عرب ممالک اور حتیٰ کہ مکہ تک بھی گئے۔ میں نے ابھی حال ہی میں کچھ اور جگہوں پر بھی پڑھا کہ انھوں نے اس دوران اٹھائیس ہزار کلومیٹر کے قریب پیدل سفر کیا۔ البتہ سری لنکا جانے کے لیے انھوں نے کسی کشتی کا سہارا لیا۔ ان سفروں کے دوران انھیں بے شمار مذاہب کے سرکردہ لوگوں سے ملنے کا موقع ملا۔

کئی طویل سفر کرنے کے بعد وہ کرتارپور آ گئے۔ انھوں نے اپنی زندگی کے آخری 15 سال کرتار پور میں ہی گزارے اور ان کی وفات بھی یہیں ہوئی۔ ان کی موت کے بعد مسلمانوں، ہندوؤں اور سکھوں میں یہ تنازعہ پیدا ہوا کہ انھیں کس طریقے سے دفنایا جائے۔ پھر کچھ یوں ہوا کہ ان کی میت پر چادر ڈال دی گئی اور جب کچھ عرصے بعد وہ چادر اٹھائی گئی تو وہاں کوئی جسم نہیں تھا بلکہ چند پھول پڑے ہوئے تھے۔ چادر کے دو حصے کیے گئے۔ ایک کو مسلمانوں نے دفن کیا اور دوسرے کو سکھوں نے اپنے طریقے سے جلا دیا۔

ایک دلچسپ بات یہ بھی ہے کہ ان طویل سفروں میں بھائی مردانہ بھی ان کے ساتھ رہے۔ بھائی مردانہ ان کے بچپن کے دوست تھے اور ایک مسلمان خاندان میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے بارے میں سکھوں کا یہ خیال ہے کہ وہ پہلے سکھ تھے۔

یہ بات بھی دلچسپ ہے کہ بھائی مردانہ کے خاندان کے اکثر بچے بچپن میں ہی مر جاتے تھے۔ بھائی مردانہ گرونانک جی کو لے کر اپنی والدہ کے پاس چلے گئے۔ ان کی والدہ بچے کو دیکھ کر رونے لگ گئیں اور کہا یہ بچہ بھی مر جائے گا۔ اس لیے یہ بھی "مر جانہ" ہے، یعنی جس نے مر جانا ہو۔ گرونانک جی نے اس عورت سے کہا کہ آپ اس کا نام، مردانہ یعنی جو مرے گا نہیں، رکھیں اور میں اس کی حفاظت کروں گا۔ یہ بچہ بھائی مردانہ کے نام سے مشہور ہوا اور اس کا ذکر بابا گورو نانک صاحب کے نام کے ساتھ ساتھ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہونے لگا۔
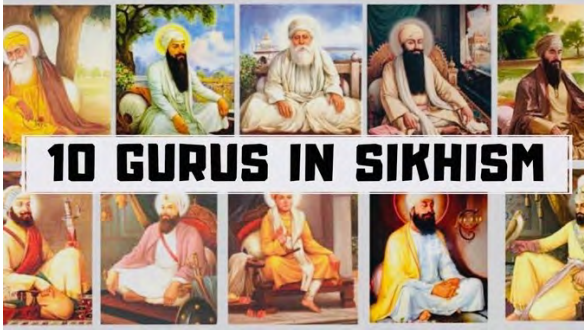
Photo Credit:Tentaran through Youtube

بھائی مردانہ آخری وقت تک بابا گورو نانک صاحب کے ساتھ رہے۔ وہ کافی پڑھے لکھے آدمی تھے اور انھیں بہت سی باتیں یاد تھیں۔ بابا گورو نانک صاحب گنگناتے تھے اور بھائی مردانہ ان کے ساتھ موسیقی کے آلات بجاتے تھے۔اس طرح وہ دونوں مل کر اپنی باتوں کی تبلیغ کرتے تھے۔ بھائی مردانہ کا بھی سکھ مذہب میں ایک بہت بڑا مقام ہے۔تاریخ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ انھی سفروں کے دوران ہی بھائی مردانہ کی وفات ہوئی۔

سکھ مذہب کی شروعات

مہندر جی نے کہااس سے پہلے کہ میں آپ کو سکھ دھرم کی باتیں بتاؤں، آپ کو کچھ بنیادی باتوں کا علم ہونا ضروری ہے۔مثال کے طور پر سکھ اپنے مذہب کو گورومت کہتے ہیں۔ یعنی گورو کا راستہ اور مت کا مطلب ہے گورو سے سیکھنے اور پڑھنے والا۔ اس سے آپ سمجھ سکتے ہیں کہ سکھ دھرم کا آغاز ہی پڑھنے سے ہوتا ہے۔ یہ بالکل اسی طرح سے ہے جیسے میں نے اسلام میں پڑھا ہے کہ آپ کے قرآن کی جو پہلی بات آپ کے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) تک پہنچائی گئی تھی اس کا پہلا لفظ بھی پڑھنا ہی تھا۔ میں یہ تو نہیں کہوں گا کہ سکھ دھرم کا آغاز بھی اسلام کی طرح سے ہی ہوا لیکن میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ سکھ

دھرم کا آغاز بھی پڑھنے یا سیکھنے سے بھی ہوتا ہے۔ اس کے ماننے والے کو طالبعلم ہی کہا جاتا ہے۔ یہ بات میرے لیے بالکل ہی نئی تھی۔ ہمارے ہاں تو سکھوں اور پٹھانوں سے متعلق اس قدر لطیفے مشہور ہیں جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ایک سازش کے تحت ان لوگوں کو بیوقوف، عقل سے عاری ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ سکھ دھرم ہندوؤں سے بالکل مختلف مذہب ہے جبکہ ہندوؤں اور کچھ سکھوں کا یہ کہنا ہے کہ سکھ دھرم اور ہندومت ایک ہی ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ سکھ دھرم اور ہندومت کے درمیان کافی باتیں مشترک بھی ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے سندھ کے کئی مندروں میں بابا گورو نانک صاحب کی تصاویر دیکھی ہیں لیکن کسی بھی گردوارے میں ہندوؤں سے متعلقہ کوئی چیز نہیں دیکھی۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ سکھ اپنے آپ کو مسلمانوں کی نسبت ہندوؤں کے زیادہ قریب سمجھتے ہیں۔ اس کی وجہ سکھوں اور مغل حکمرانوں کی لڑائیاں بھی ہوسکتی ہیں یا مذہبی معاملات میں کئی مشترکہ چیزیں یا بابا گورو نانک صاحب کا ایک ہندو کی اولاد ہونا بھی ہوسکتا ہے۔ اس کا ایک ثبوت تقسیم ہند کے موقع پر سکھوں کا طرزِ عمل بھی ہے۔

میں نے مہندر جی سے پوچھا کہ آپ گورو کسے کہتے ہیں اور ان کی تعداد کتنی ہے؟

مہندر جی کہنے لگے کہ ہمارے بابا گرو نانک صاحب سمیت دس گورو یعنی استاد یا راہ نما ہیں۔ ان میں سے آخری گورو گوبند سنگھ ہیں۔ جو 1708ء میں عالمگیر کی وفات کے ایک سال بعد شہید کر دیے گئے۔ سکھ مسلمانوں کے ہاتھوں قتل ہونے والے سکھوں کو شہید کہتے ہیں۔ اورنگزیب کی وفات کے بعد ان کے جانشینوں میں کشمکش شروع ہو گئی۔ اس وقت گرو گوبند سنگھ مہاراشٹرا میں تھے اور انھیں ان کے کیمپ میں دو پٹھانوں، جمشید خان اور واصل بیگ نے قتل کر دیا۔ سکھوں کا خیال ہے کہ انھیں وزیر خان نے بھیجا تھا۔ یاد رہے کہ چمکور کی جنگ میں انھیں بچانے والے بھی دو پٹھان ہی

تھے۔ ان کی موت کے بعد ہم گرنتھ صاحب کو اپنا گیارہواں گورو مانتے ہیں اور یہ بھی کہتے ہیں کہ اس کتاب میں وہ تمام تر ضروری باتیں موجود ہیں جس کے بعد سکھوں کو کسی اور گورو کسی کتاب کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ ہماری ایک مقدس کتاب ہے جیسے دیگر مذاہب کی کتابیں ہیں۔ آج دنیا بھر میں تین کروڑ کے قریب سکھ رہتے ہیں اور ان کی اکثریت پنجاب میں ہے۔ یہ بالکل مسلمانوں کی طرح ہی ہے کہ جیسے ان کے نبی کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا اور قران کے بعد کوئی الہامی کتاب نہیں ہو گی۔

میں نے مہندر جی سے پوچھا کہ گرنتھ کا مطلب کیا ہے اور یہ کس زبان سے نکلا ہے۔

انھوں نے بتایا کہ مجھے اس کا کوئی درست جواب تو معلوم نہیں ہے لیکن اب یہ لفظ خاص طور پر سکھوں کی مذہبی کتاب کے لیے استعمال ہوتا ہے اور ہم اسے گرو گرنتھ صاحب کہتے ہیں۔ یہ ایک بڑی کتاب ہے جس میں بہت سے اشعار ہیں اور وہ گا کر بھی پڑھے جاتے ہیں۔

میں نے اپنے طور پر گرنتھ صاحب کا مطلب جاننے کی کافی کوشش کی اور جو باتیں مجھے معلوم ہو سکیں، وہ پیشِ خدمت ہیں۔

گرنتھ کا لفظ گورو سے نکلا ہے، یعنی گورو کی باتیں، یہ میرا ذاتی خیال ہے۔ ممکن ہے درست نہ ہو۔ کسی کی دل آزاری مقصود نہیں ہے اس لیے اصلاح کے لیے ہر وقت حاضر ہوں۔ اس کتاب کے 1430 صفحات ہیں۔ جس میں 5,894 سطریں ہیں۔ ہر سطر کو ایک خاص ترتیب اور ایک خاص ترنم کے ساتھ آلات موسیقی کی مدد سے پڑھا جاتا ہے۔ کتاب کو 31 بڑے حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے اور اس کے آگے بھی کئی حصے ہیں۔ اسے گرمکھی طرز تحریر میں پنجابی زبان میں لکھا گیا ہے۔ پنجابی زبان کے علاوہ اس کتاب میں کئی اور زبانوں کے الفاظ بھی شامل ہیں جن میں سنسکرت سندھی اور فارسی ہے۔

سکھوں کی مذہبی کتابوں کے مطابق چھ مختلف گوروں نے اس میں اپنی باتیں لکھی ہیں۔ اس کے علاوہ اس کتاب میں بھگتی تحریک کی چیزیں بھی مل جاتی ہیں، بھگت کبیر کے اشعار کے علاوہ کئی مسلمان صوفی شعراء خاص طور پر بابا فرید کے شعر بھی اس میں شامل ہیں۔ اس کتاب میں زیادہ تر باتیں رحم دلی، محبت، پیار، انصاف، ظلم و ستم سے پاک معاشرے اور دیگر مذاہب خاص طور پر ہندو مت اور اسلام کے احترام سے متعلق ہیں۔ غرضیکہ یہ کتاب ایک مطمئن انسانی زندگی گزارنے، امن و آشتی کا پیغام پھیلانے اور انسانوں کی خدمت کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے ایک اہم کتاب ہے۔

اس کتاب سے متعلق ایک داستان مشہور ہے۔

اکبر کے دور میں کسی نے اس سے کہا کہ اس کتاب میں اسلام کے خلاف باتیں لکھی ہوئی ہیں۔ اکبر نے کتاب منگوائی اور جب اسے پڑھ کر سنایا گیا تو اس میں کچھ ایسا نہیں تھا۔ اس پر اکبر نے خوش ہو کر اس کتاب کے لیے سونے کے سکے انعام میں دینے کا اعلان کیا لیکن وہ جلد ہی مر گیا! اس کی وفات کے بعد اس کے بیٹے جہانگیر نے اس کتاب سے متعلق رائے بدل لی اور یہی وہ دور تھا جب سکھوں اور مغلوں کے درمیان اختلافات کا آغاز ہوا۔

اب تک میں نے جو کچھ پڑھا ہے، اس کے مطابق اکبر تمام مذاہب کو ساتھ لے کر چل رہا تھا۔ اس وقت ابھی سکھ دھرم کی شروعات ہی ہو رہی تھی لیکن اس کے باوجود بھی کافی لوگ سکھ دھرم میں شامل ہو چکے تھے اور ان کا مسلمانوں سے کوئی جھگڑا بھی نہیں تھا لیکن اس کے بعد جہانگیر نے جہاں مسلمان صوفیاء کو تنگ کیا، انھیں گرفتار کیا (مجدد الف ثانی کی گرفتاری) وہیں اس نے سکھوں کے خلاف بھی بہت سے ایسے کام کیے

جو سکھوں اور مغل حکمرانوں کے درمیان ایک بڑی جنگ کی بنیاد ثابت ہوئے۔ ہم اس جنگ کے اثرات تقسیم ہند میں بھی دیکھتے ہیں۔

میں نے گرنتھ صاحب کا اردو ترجمہ دیکھا ہے کیونکہ اس کی پنجابی زبان میرے جیسے ایک پنجابی دیہاتی پس منظر رکھنے والے اہل زبان کے لیے بھی سمجھنا مشکل ہے۔ بے شمار ایسے الفاظ ہیں جو اب استعمال نہیں ہوتے۔ اس کتاب کے آغاز میں جو کچھ درج ہے اس میں اس کائنات کے مالک کے بارے میں یہ کہا گیا ہے کہ وہ یکتا ہے، مالک ہے، خالق ہے اور اس کا کوئی شریک نہیں۔

میں نے اس سلسلے میں ڈاکٹر ذاکر نائیک صاحب کی ایک تقریر بھی سنی۔ انھوں نے ایک سوال کے جواب میں کہا کہ مجھے معلوم نہیں کہ بابا گورو نانک صاحب مسلمان تھے یا نہیں البتہ ان کا خدا کے بارے میں تصور مسلمانوں سے ملتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ ان کے نزدیک بابا گورو نانک صاحب نے ہندومت اور اسلام میں موجود بے شمار باتوں کو یکجا کیا ہے۔ وہ اسلام سے کافی متاثر تھے۔ اسی سلسلے میں انھوں نے مکہ کا سفر بھی کیا۔

علامہ اقبال نے بھی بابا گورو نانک صاحب کے بارے میں بانگ دار میں ایک نظم بھی لکھی ہے جس کا عنوان " نانک " ہے اس نظم کے اشعار کچھ یوں ہیں۔

نانک

قوم نے پیغامِ گوتم کی ذرا پروا نہ کی

قدر پہچانی نہ اپنے گوہرِ یک دانہ کی

آہ ! بد قسمت رہے آوازِ حق سے بے خبر

غافل اپنے پھل کی شیرینی سے ہوتا ہے شجر

آشکار اُس نے کِیا جو زندگی کا راز تھا

ہند کو لیکن خیالی فلسفے پر ناز تھا

شمعِ حق سے جو منّور ہو یہ وہ محفل نہ تھی

بارشِ رحمت ہوئی لیکن زمیں قابل نہ تھی

آہ ! شُودر کے لیے ہندوستاں غم خانہ ہے

دردِ انسانی سے اس بستی کا دل بیگانہ ہے

برہَمن سرشار ہے اب تک مئے پندار میں

شمعِ گوتم جل رہی ہے محفلِ اغیار میں

بُت کدہ پھر بعد مُدّت کے مگر روشن ہُوا

نُورِ ابراہیمؑ سے آزر کا گھر روشن ہُوا

پھر اُٹھی آخر صدا توحید کی پنجاب سے

ہند کو اک مردِ کامل نے جگایا خواب سے

اس نظم میں اقبال نے بابا گورو نانک صاحب کی توحید پرستی کی تعریف کی ہے۔ گورو گرنتھ صاحب کے چند اشعار جس سے توحید کا اظہار ہوتا ہے۔

ایکو ہے بھائی ایکو ہے	صاحب میرا ایکو ہے
آپ لیو دیئے	آپے مارے آپے چھوڑے
آپے نذر کریئے	آپے دیکھے وگے
اور نہ کرنا جائی	جو کچھ کرنا سو کر رہیا
سب تیری وڈیائی	جیسا درتے تیسو کہیئے

- ترجمہ:

1. میرا مالک ایک ہے، ہاں ہاں بھائی وہ ایک ہے
2. وہی مارنے والا اور زندہ کرنے والا ہے، وہی دے کر خوش ہوتا ہے
3. وہی جس پر چاہتا ہے، اپنے فضلوں کی بارش کر دیتا ہے
4. وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے، اس کے بغیر اور کوئی بھی نہیں کر سکتا
5. جو کچھ دنیا میں ہو رہا ہے ہم وہی بیان کرتے ہیں، ہر چیز اس کی حمد بیان کر رہی ہے
6.

اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ایک توحید پرست شخص تھے۔ تاریخ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ آپ نے کئی مسلمان صوفیاء کے ہاں بہت وقت گزارا اور وہ سب ان کی تعلیمات سے بھی ظاہر ہوتا ہے۔ اردو کے کئی شعراء نے بابا گورو نانک صاحب کے بارے میں بہت کچھ لکھا ہے۔ بابا گورو نانک صاحب سے متعلق سید اصغر بہرائچی کے چند اشعار:

ہزاروں میں کوئی ہوتا ہے اک انسان وہ دانا

کہ جس نے زندگی کا راز ہو، دراصل پہچانا

تلونڈی میں سحر کو جب گرو نانک ہوئے پیدا

تو کالو چند کے گھر میں اجالا نور کا پھیلا

جہاں کی بے ثباتی پر ہنسے جب آپ اک دم سے

ترپتہ ماں وداعی دوستاں قرباں ہوئیں جھم سے

حصول علم میں نکلے، تو طے منزل پہ کی منزل

نہ چھوڑی بزم کوئی اور نہ چھوڑی کوئی بھی محفل

خدا کی ذات بابرکات کو واحد جو پہچانا

اسی تحقیق پر دنیا نے ہے ان کو گرو مانا

بابا گورو نانک صاحب: رب کے فرستادہ یا ایک نیک شخص

میرا اگلا سوال مہندر جی سے یہ تھا کہ کیا بابا گورو نانک صاحب رب کے فرستادہ تھے یا ایک نیک شخص تھے؟ اس بات کے جواب میں انھوں نے جو کہا وہ قابلِ غور ہے۔

مہندر جی کہنے لگے کہ دنیا میں مذہب دو طرح کے ہیں۔ ایک جسے آپ لوگ آسمانی مذہب کہتے ہیں، جیسے عیسائیت، اسلام، یہودیت۔ آپ لوگوں کا عقیدہ ہے کہ ان مذاہب کے بانی اللہ کے پیغمبر تھے اور تینوں مذہبی کتابیں اللہ کی کتابیں ہیں۔ ان میں لکھی ہوئی باتیں کسی انسان کی نہیں ہیں۔ اس کے برعکس، دنیا میں بے شمار مذاہب ایسے ہیں جن کے متعلق یقین سے کہنا مشکل ہے کہ وہ الہامی ہیں اور ان کی کتابیں بھی در

اصل اوپر والے کے احکامات ہی ہیں اور اسی طرح سے لکھی گئی ہیں جس طرح سے اُس نے کہا ہے۔ ان مذاہب میں بدھ مت، جین مت، ہندومت، زرتش کے علاوہ بھی کئی شامل ہیں۔ اسی طرح سکھ دھرم کے متعلق یہ کہنا کہ یہ مذہب ایک الہامی مذہب ہے، مشکل ہے۔ ہاں البتہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہو گا کہ بابا گورو نانک صاحب نے اسوقت کے موجود تمام ادیان کو پڑھا، ان کے عالموں سے بات چیت کی، جن میں سرِ فہرست اسلام اور ہندومت تھا اور انھوں نے دونوں میں سے کچھ چیزوں کو لیا اور اس بات کا پرچار کیا کہ نہ کوئی ہندو اور نہ کوئی مسلمان۔ اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے کئی اور لوگوں کی باتوں کو بھی پسند کیا جیسے بھگت کبیر جیسے لوگ۔

مہندر جی نے مزید کہا کہ ہمارے ہاں کچھ لوگوں کا یہ خیال ہے کہ بابا گورو نانک صاحب اللہ کے بھیجے ہوئے ایک پیغمبر تھے۔ انھیں اوپر والے سے براہِ راست احکامات ملتے تھے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ وہ ایک نیک اور پارسا شخص تھے جنھوں نے معاشرتی برائیوں کو دور کرنے کے لیے اور ہندو مسلم اتحاد کے لیے ایک ایک نئی سوچ کو جنم دیا۔ ایسی سوچ کا پیدا ہونا بھی اسی اوپر والے کی دین ہے۔ اس لیے میرا یہ خیال ہے کہ وہ ایک مختلف سوچ رکھنے والے فرد تھے۔ انھوں نے معاشرہ میں ہونے والی برائیوں، اونچ نیچ کے چلن، لالچ اور لوب کے ساتھ ساتھ ظلم و ستم کو روکنے کے لیے کام کیا۔ اس کے لیے انھوں نے ایک نئے دھرم کی بنیاد رکھی۔ یہ کہہ کے مہندر جی کچھ دیر کے لیے رکے۔

یہ بھی ایک دلچسپ بات ہے کہ انھوں نے اپنی زندگی میں کبھی بھی اپنی بات کو ایک نئے دھرم سے تشبیہ نہیں دی۔ وہ ایسا نہیں کرنا چاہتے تھے۔ ان کا مقصد تو جوڑنا تھا۔ سکھ کا لفظ بھی انھوں نے سیکھنے والے کے لیے بولا، جو اب سکھ دھرم کے لوگ اپنی پہنچان کے لیے بولتے ہیں۔ یہ سب کہہ کر مہندر جی نے آخر میں کہا کہ یہ ایسا معاملہ ہے جس پر بات کرتے ہوئے مجھے ڈر لگتا ہے۔ کیونکہ اس بارے میں کئی لوگ بڑی سخت رائے

رکھتے ہیں۔ البتہ میں اتنا تو ضرور کہوں گا کہ بابا گورو نانک صاحب ایک اوپر والے کے بھیجے ہوئے اگر نہیں بھی تھے پھر بھی اوپر والے کی آشیر آباد انھیں ضرور حاصل تھی۔ یہ کہہ کر مہندر جی نے بات ختم کردی۔

میں نے سکھ دھرم کا جتنا بھی مطالعہ کیا ہے اس میں کہیں بھی بابا گورو نانک صاحب کبھی بھی اپنے نبی ہونے یا رب سے براہِ راست رابطہ کا دعویٰ نہیں کیا۔ انھوں نے ہمیشہ ایک خدا کی پرستش کی بات کی ہے اور کہیں بھی کسی کو اپنی ذات کی طرف نہیں بلایا۔ میں نے اس سارے کام کو ایسا ہی پایا ہے۔

میں نے مہندر جی سے پوچھا کہ میں نے دیکھا ہے کہ ہر گردوارے پر ایک جھنڈا لگا ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ایک نشان بنا ہوتا ہے اور ساتھ ہی گورمکھی زبان میں کچھ لکھا ہوتا ہے۔ یہ کیا لفظ ہے اور اس کا کیا مطلب ہے؟

انھوں نے کہا کہ اس کا مطلب ہے، اک اونکار۔ اس سے مراد ہے کہ ہم سب کا رب، خدا ایک ہے۔ وہی ہر طرح کی طاقت کا مالک ہے۔ جی بالکل ایسا ہی ایک لفظ ہے جیسا مسلمان اللہ کا نام لیتے ہیں۔ ہندوؤں اس کے لیے اوم کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ جس کا مطلب بھی خدا ہی ہے۔

ہمارے تصورِ خدا میں اور ہندوؤں کے تصور میں فرق ہے۔ اگر میں یہ کہوں کہ اک اونکار کے معنی وہی ہیں جس طرح کے معنی آپ کے اسلام میں اللہ کے لیے ہیں۔ ہم یہ مانتے ہیں کہ خدا یا رب یکتا ہے، مالک کائنات ہے، اس کا کوئی خاندان نہیں، وہ لا شریک ہے، وہی خالق ہے، وہی زندگی دیتا ہے وہی موت دیتا ہے تو غلط نہیں ہوگا۔

اس کی تفصیل آپ کو گرنتھ صاحب میں مل سکتی ہے۔ سکھ مذہب میں اس کے علاوہ بھی کئی الفاظ اس کے ہم معنی ملتے ہیں، جیسے، اکل پورکھ، واہ گورو، نرنکار۔ یہ الفاظ

بھی ہم رب کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ یہ بالکل اسی طرح ہے جیسے آپ کے اسلام میں اللہ کے علاوہ بھی کئ صفاتی نام ہے۔ اسی طرح کا معاملہ ہمارا ہے۔ میں نے پوچھا کہ آپ ایک دوسرے سے ملتے وقت واہگرو جی کا خالصہ واہگرو جی کی فتح کہتے ہیں۔ آپ لوگ اکثر یہ نعرہ بھی لگاتے ہیں۔ اس سے کیا مراد ہے؟

واہگرو کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ وہ خدا جو دنیا میں وحی کے ذریعے روشنی پھیلاتا ہے۔ واہ کا مطلب روشنی دینے والا، سچ بتانے والا، جب کہ گورو کا مطلب بڑا بزرگ، استاد، راہ دکھانے والا۔ خالصہ کا لفظ اخلاص سے ہے، یہ عربی زبان کا لفظ ہے۔ اس کا وہی مطلب ہے جو عربی میں ہے، یعنی صاف ستھرا، کھرا، خالص۔ اس لیے جب ہم ملتے ہیں ہم بھی کہتے ہیں کہ میں وہ ایک واحد خدا کا خالص اور صاف ستھرا ماننے والا ہوں، اور ساتھ یہ کہتے ہیں کہ اسی خدا کو فتح حاصل ہو گی۔ عام طور پر جب سکھ ملتے ہیں تو واہگرو جی کا خالصہ واہگرو جی کی فتح کم ہی کہتے ہیں۔ یہ کچھ خاص سکھوں کے لیے بولا جاتا ہے۔ یا پھر کسی جلسے یا جلوس میں جوش پیدا کرنے کے لیے بولا جاتا ہے۔

میرا اگلا سوال ست سری اکال کے بارے میں تھا۔ جو میں نے اکثر سکھوں کو جب وہ آپس میں ملتے ہیں تو بولتے ہیں۔ اس کے بارے میں مہندر جی نے کہا کہ ست کا مطلب ہے سچ، سری، ادب کے معنوں میں بولا جاتا ہے اور اکل کا معنی ہے ہمیشہ رہنے والا۔ اس پورے فقرے کا مطلب بنتا ہے

سچا خدا جو ہمیشہ رہنے والا ہے۔۔۔ جواب میں سامنے والا سکھ بھی یہی کہے گا۔ اوپر والے کے کرم سی ہوتا ہے۔

میں نے اونکار کا مظلب جاننے کی کوشش کی تو مجھے پتہ چلا کہ آروند مندیر نے لکھا ہے کہ گورو گرنتھ صاحب کے شروع میں اونکار کا بیان کچھ اسطرح سے ہے جو میں نے

گور مکھی، اردو اور انگریزی میں درج کیا ہے۔ یہ سری گرنتھ صاحب کی جلد اول، جپجی جی کا پہلا شعر ہے، یعنی اس سے اس کتاب کا آغاز ہوتا ہے۔ اس پر ایمان لانا ہر سکھ پر فرض ہے۔

ੴਸਤਿਨਾਮੁਕਰਤਾਪੁਰਖੁਨਿਰਭਉਨਿਰਵੈਰੁਅਕਾਲਮੂਰਤਿਅਜੂਨੀਸੈਭੰ ਗੁਰਪ੍ਰਸਾਦਿ॥

اِکْ اَونکار سَتّ نام، کرتا پرکھ، نِربَھو، نِرویر۔ اکال، مورت اجونی، سے بھنگ، گُر پرساد۔

خدائے واحد ہی سچ ہے، وہ خالق ہے، اسے کسی کا ڈر نہیں، اس کی کسی سے دشمنی نہیں، وہ اکیلا ہے، اس کی کوئی صورت نہیں، وہ زندگی اور موت کے چکر سے آزاد ہے، اس کا حصول ہی اصل نعمت ہے

This Being is one, truth by name, creator, fearless, without hatred, of timeless form, unborn, self-existent, and known by the Guru's grace

میں نے ہرمندر جی سے پوچھا کہ آپ کے پہلے نو گوروؤں کے ناموں کے ساتھ سنگھ کا لفظ نہیں لگتا، نہ ہی کسی عورت کا کور کہا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ خالصہ کا لفظ بھی استعمال میں نہیں تھا۔ ان الفاظ کا مطلب کیا ہے اور یہ کب شروع ہوئے؟

انھوں نے جو مجھے بتایا اس کے مطابق آخری گورو، گورو گوبند رائے نے 1699ء بیساکھی کے موقع پر انند پور جو کہ ضلع روپڑ میں دریائے ستلج کے کنارے ایک قصبہ ہے میں دور پار کے رہنے والے تمام سکھوں کو بلوایا۔ اس وقت ہندوستان پر عالمگیر کی حکومت تھی اور چند سال پہلے 1675ء میں گرو تیغ بہادر جو کہ گورو گوبند رائے کے والد

تھے ان کو قتل بھی کیا جا چکا تھا۔ اس سے یہ محسوس ہوتا تھا کہ اس وقت سکھوں اور عالمگیر کے درمیان ایک بہت بڑی جنگ جاری تھی۔

انند پور میں ایک بڑے مجمع کے سامنے انھوں نے اپنی تلوار نکالی اور لوگوں سے کہا کہ کون ہے جو گورو کی خاطر اور سچ کی خاطر اپنی جان دینے کو تیار ہے؟ کوئی ہے تو وہ سٹیج پر آئے۔ ایک صاحب آگے بڑھے۔ گورو لے کر انھیں اپنے کمرے میں چلے گئے۔ اور تھوڑی دیر کے بعد خون آلود تلوار کے ساتھ باہر آئے۔ اس طرح سے انھوں نے پانچ بار کیا۔ لیکن یہ پانچوں لوگ محفوظ تھے ان کو کسی طرح کوئی نقصان نہیں پہنچا تھا۔ اس سب کا مقصد لوگوں کو آزمانہ تھا۔ ان پانچ لوگوں کو پانچ پیارے کا کا نام دیا گیا۔ ان کے نام بھی تاریخ میں ملتے ہیں اور پھر ان کو خالصہ کا لقب دیا گیا اس طرح سے مردوں کے لیے سنگھ کا لفظ اور عورتوں کے کور لفظ استعمال کرنے کا کہا گیا۔

میں نے اپنے طور پر جب اس بات کو جاننے کی مزید کوشش کی تو مجھے ایک بہت ہی عجیب بات کا پتہ چلا، جسے جان کے مجھے حد درجہ حیرانی بھی ہوئی اور خوشی بھی۔

گورو گوبند رائے نے اس واقعہ کے بعد اپنے نام کے ساتھ رائے کی بجائے سنگھ کا لفظ استعمال کرنا شروع کر دیا تھا، ایک بہت ہی پڑے لکھے گورو تھے۔ انھوں نے سکھ دھرم میں بہت سی نئی چیزیں بھی متعارف کروائیں۔ ان کی زندگی کے اوپر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ لیکن سنگھ خالصہ اور کور کے پیچھے ایک زبردست سوچ کارفرما ہے جن کا آغاز انھوں نے کیا۔

سنگھ کا لفظ عام ہونے سے پہلے لوگ اپنے نام کے ساتھ اپنے قبیلے، برادری یا ذات پات کا نام لگاتے تھے، جیسے؛ رانا، راجپوت، چیمہ، مانگٹ، جاٹ، گجر وغیرہ وغیرہ۔ ایسا کرنے سے جو بڑی ذات کے لوگ ہوتے تھے وہ ایک فخر محسوس کرتے ہیں اور کمزور

ذات کے لوگ نفسیاتی طور پر اپنے آپ کو کمزور محسوس کرتے تھے۔اب بھی ایسا ہی ہے۔اس سے۔برادری کی بنیاد پر گروہ بندی بھی پروان چڑھتی تھی۔

گورو گوبند سنگھ نے اس اونچ نیچ کو ختم کرنے کے لیے اور سکھوں کے درمیان میں ایک مساوات قائم کرنے تاکہ خاندانی غرور ختم ہو جائے، سکھوں سے کہا کہ ہر سکھ اپنے نام کے ساتھ سنگھ کا لفظ استعمال کرے گا۔ جیسے مرد کے لیے سنگھ تھا اسی طرح عورت کے لیے کور، جس کا مطلب ملکہ ہے کا لفظ استعمال کیا جانے لگا۔ تاکہ عورت اور مرد کے درمیان بھی یکسانیت رہے۔ ایسا ہی خالصہ لفظ کے استعمال کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس سے مراد ہے ایک ایسا شخص جو سکھ دھرم کے لیے خالص ہو کر اور سکھ دھرم کے اصولوں کے مطابق زندگی گزارے اور سکھ دھرم کی خاطر ہر طرح کی قربانی دینے کے لیے تیار رہے۔ گورو گوبند سنگھ کی اس تحریک کے نتیجہ میں سکھ ایک فوجی طاقت بن کر ابھرے اور مغل حکمرانوں سے کئی لڑایاں لڑیں اور یہی وہ لوگ تھے جو انگریزوں کا آخری وقت تک مقابلہ کرتے رہے۔

الفاظ میں بہت طاقت ہوتی ہے۔

میں نے مہندر جی سے یہ پوچھا کہ ان کی تعلیمات کا لب لباب کیا ہے؟ اس کا جواب تو انھوں نے بہت مختصر دیا کیونکہ ابھی بہت سے سوال باقی تھے۔ بس کی روانگی کا وقت بھی ہو رہا تھا، چائے تو کب کی ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ بچے بھی تازہ دم ہو چکے تھے۔ سرہند پولیس بھی منتظر تھی کہ کب یہ لوگ ان کے تھانہ کی حدود سے باہر نکلیں اور ان کی خلاصی ہو۔ میں تھا جو اس شہر میں زیادہ سے زیادہ وقت گزرانا چاہتا تھا جہاں میرے آباؤاجداد دفن تھے، جہاں میرے والد کی پیدائش کی خوشی میں ایک بڑی دعوت کا اہتمام کیا گیا تھا، جہاں میری والدہ اپنے بچپن میں ایک کنویں میں گری تھیں، جہاں میرا ننھال اپنی جان بچانے کے کے لیے ایک سکھ سردار کی حفاظت میں اپنا مذہب بدل کر رہے تھے، جہاں بہت کچھ تھا لیکن وہ نہیں تھے جنہوں نے اس شہر میں جنم لیا تھا۔

مہندر جی نے مجھے بتایا کہ سکھ دھرم میں شروع سے دسویں گوروتک اور اس کے بعد بھی تبدیلی ہوتی رہی ہے۔ جیسے جیسے معاشرتی اور سیاسی حالات بدلتے گئے سکھ دھرم میں بھی تبدیلی آتی گئی۔ یہ کوئی الہامی مذہب تو نہیں تھا۔ ایک نیک سیرت شخص نے معاشرے میں موجود ذات پات کے نظام کے خلاف آواز اٹھائی اور کئی خداؤں کو ماننے والوں کو ایک خدا کو ماننے کے لیے کہا۔ اس نے کہا ایک ہی سچا بادشاہ ہے۔ اسی کی پوجا کرو، کسی بت، کسی مورت کی پوجا نہ کرو، سچ بولو، سچا سودا کرو، لوگوں کی خدمت کرو، امن و پیار میں محبت سے زندہ رہو۔ انھوں نے کسی طرح کی کوئی کتاب نہیں لکھی اور نہ ہی ایسی بات کہی کہ جس میں کبھی اضافہ نہ کیا جائے۔ انھوں نے کوئی سیاسی یا معاشی نظام بھی نہیں دیا۔

سکھ دھرم انفرادی طرزِ زندگی کے لیے راہ نمائی مہیا کرتا ہے۔ وہ ستر سال تک زندہ رہے اور تقریباً چوبیس سال تک سفر ہی کرتے رہے۔ آخری پندرہ سال کرتار پور میں گزارے اور اسی دور میں اپنی باتیں لوگوں تک پہنچائیں۔

میں نے اپنے طور پر یہ جاننے کی کوشش کی کہ کرتار پور کا نام کرتار پور کیوں ہے؟ کافی تحقیق کرنے کے بعد پتہ چلا کہ کرتار کا مطلب ہے پیدا کرنے والا۔ یعنی گرونانک نے جہاں اپنی زندگی کے آخری دن گزارے وہ ایک ویران علاقہ تھا۔ دریائے راوی کے کنارے انھوں نے اپنا ایک ڈیرہ بنایا۔ گردوارہ تو بعد میں بنایا گیا۔ اس ڈیرے کا نام بھی انھوں نے ربِ کائنات، جسے وہ سچے بادشاہ کے نام سے بھی پکارتے ہیں، کے نام پر کرتار پور رکھا۔ ان کی زندگی کے مطالعے سے تو صرف یہی ملتا ہے کہ انھوں بدھ مت، اور جین مت کے ماننے والوں اور اس کے ساتھ ساتھ مسلمانوں اور ہندوؤں کو بھی ایک جگہ اکٹھا کرنے کی کوشش کی۔

مہندر جی نے کہا کہ ان کے دوسرے گورو انگد دیو جی تھے۔ انھوں نے ایک نیا رسم الخط؛ گرمکھی ایجاد کیا جس میں پہلی مرتبہ پنجابی زبان کو لکھا جانے لگا اور آج بھی

اسی رسم الخط میں پنجابی لکھی جاتی ہے۔ میں نے جب اس بارے میں مزید کھوج لگائی تو پتہ چلا کہ گرمکھی سے پہلے دیوانا گری، جسے صرف ناگری بھی کہتے ہیں.برہموں کا رسم الخط کہلاتی تھی۔ ہندی اب بھی اسی رسم الخط میں لکھی جاتی ہے۔ گورو انگد نے اپنے طور پر ایک نیا رسم الخط ایجاد کیا۔ گرمکھی بھی ناگری کی طرح بائیں سے دائیں لکھی جاتی تھی۔ جب مسلمان ہندوستان آئے تو انھوں نے عربی اور فارسی کے رسم الخط کی بجائے شاہ مکھی کے نام اسے ایک نیا رسم الخط ایجاد کیا۔ اب اردو اور پنجابی اسی رسم الخط میں لکھی جاتی ہے ۔ہمارے اخبارات، اور رسالے اسی رسم الخط میں چھپتے ہیں، یہ دائیں سے بائیں لکھی جاتی ہے۔ میرے علم کے مطابق عربی، فارسی اور اردو کے علاوہ بھی اکثر زبانیں بائیں سے دائیں لکھی جاتی ہیں۔

میں نے جب یہ جاننا چاہا کہ اس زبان کا نام گرمکھی کیوں ہے، تو پتہ چلا کہ اصل لفظ گورو کا مکھ (چہرہ) تھا۔ گورو کے شاگرد ارد گرد بیٹھ جاتے اور گورو انگد جی کے چہرے کی طرف دیکھتے رہتے اور جو گورو کہتے وہ لکھتے رہتے۔اس کے مقابلے میں مسلمانوں نے شاہ مکھی رسم الخط بنایا جس کا مطلب شاہ کا مکھ ہی ہو سکتا ہے۔

مہندر جی نے دوبارہ بات شروع کی اور کہنے لگے کہ ہمارے تیسرے گورو، گورو امر داس ہیں جو ایک طویل عرصے تک زندہ رہے۔ انھوں نے ذات پات کے خلاف سب سے زیادہ باتیں کیں اور معاشرے میں غریب اور امیر کے درمیان فرق کو کم کرنے کے لیے بے حد کوشش کی۔ گورو امر داس کا سب سے بڑا کارنامہ ان کا دیا ہوا لنگر خانے کا تصور تھا۔ جو مل جل کر ایک ہی جیسا کھانا کھانے کے تصور سے معاشرے میں مساوات پیدا کرنے کے لیے اپنایا گیا تھا۔

گردوارے میں جو لوگ بھی آتے ہیں وہ امیر ہو یا غریب، مالک ہو یا ملازم، سب کو ایک جیسا ہی کھانا ملتا ہے۔ ایک ہی جگہ بیٹھ کر کھانا کھاتے ہیں۔ لنگر خانے کے

رواج نے معاشرے میں بھائی چارے کے تصور کو بے حد پروان چڑھایا اور اس میں وہ بہت کامیاب بھی ہوئے۔ لنگر خانے میں کسی کو بھی آنے سے منع نہیں کیا جاتا۔ یہ کہہ کر مہندر جی نے گھڑی کی طرف دیکھنا شروع کیا اور کہا ہمارے پاس چند منٹ ہی بچے ہیں اس لیے ہمیں اپنی بات جلدی ختم کرنا ہو گی۔ میں نے کہا جی ضرور۔

میں نے خود بھی بہت سے گردواروں میں دیکھا ہے کہ وہاں پر سب لوگ زمین پر بیٹھ کر کھانا کھاتے ہیں۔ ایک اور دلچسپ بات یہ ہے کہ گردواروں میں دال اور سبزی ہی پکتی ہے۔ مسلمان صوفیاء کے مزاروں پر بھی دال اور سبزی ہی پکتی ہے۔ کسی بھی طرح کا کوئی گوشت نہیں پکایا جاتا۔ ایسا گروامر داس جی نے مسلمان صوفیاء کو دیکھتے ہوئے کیا یا خود ہی انھوں نے اسے بہتر جانا۔ ایسا کرنے سے ہندو اور جین مت سے تعلق رکھنے والے لوگ بھی، جو گوشت نہیں کھاتے گردواروں میں آتے اور کھانا کھاتے تھے۔

گوروامر داس کا شروع کیا ہوا وہ سلسلہ آج سکھ دھرم کی پہنچان بن گیا ہے۔ اب دنیا بھر میں کوئی بھی ایسا گردوارہ نہیں ہے جہاں لنگر نہ ہو۔ وہاں ہر وقت کھانا میسر ہوتا ہے۔ یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ کھانا پکانے سے تقسیم کرنے کے عمل تک بے شمار لوگ خدمت کی نیت سے یہ کام کرتے ہیں۔ ایسے لوگ، اس خدمت کو سیوا کا نام دیتے ہیں۔

گوروامر داس جی نے سکھ دھرم میں سکھوں کی شادی کے لیے آنند کاراج کا رواج بھی شروع کیا۔ آنند کاراج کا مطلب خوشی کا کام ہے۔ اس طریقے کے تحت سکھ لڑکا اور لڑکی گردوارے میں جا کر شادی کرتے ہیں۔ 1909 ء میں اس بارے میں ہندوستان میں ایک قانون بھی بنایا گیا۔ اب سکھ دھرم میں شادی اسی قانوں اور طریقہ کے تحت ہوتی ہے۔ پاکستان میں بھی ایسا ہی ایک قانون بنایا گیا ہے۔ اس کام کا سہرا بھی گوروامر داس کے سر ہی ہے۔ میں نے مہندر جی سے پوچھا کہ ان ابتدائی سالوں میں سکھ دھرم

سے متعلق ہندوؤں کا کیا خیال تھا؟ ان کا کہنا تھا کہ وہ مدت تک اسے ہندومت کا ہی ایک حصہ سمجھتے رہے۔ مسلمان بھی اسے اچھی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

مہندر جی نے بتایا کہ ان کے چوتھے گورو، گورورام داس تھے۔ گورورام داس نے امرتسر شہر کی بنیاد رکھی اور گولڈن ٹیمپل کی تعمیر کا آغاز کیا۔ میں نے اپنے طور پر امرتسر کے معنی جاننے کی کوشش کی تو مجھے پتہ چلا کہ اس کا مطلب ہے امر ہونا یعنی جو فنا نہ ہو جبکہ دوسرا امرت سے مراد ہے، پاک صاف اور قیمتی پانی ہے۔ سر سے مراد ایسی کوئی جگہ جہاں سے کوئی چیز برآمد ہوتی ہے۔ کہتے ہیں کہ گورورام داس نے اس جگہ پر پہلے ایک تالاب بنایا اور اسے امرت سے تشبیہ دی، یعنی پاک صاف اور قیمتی پانی۔ کئی لوگوں کا یہ خیال بھی ہے کہ اس سے مراد ایک ایسی جگہ ہے جو ہمیشہ ہمیشہ قائم رہے گی، جو کبھی فنا نہیں ہو گی کیونکہ یہ سچے بادشاہ کی عبادت کی جگہ ہے۔ یاد رہے کہ گورورام داس نے اسی جگہ پر ایک عمارت کا سنگِ بنیاد میاں میر ،جو لاہور میں مدفون ہیں، سے بھی رکھوایا تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس وقت مسلمانوں اور سکھوں کے درمیان کافی ہم آہنگی پائی جاتی تھی۔

مہندر جی نے یہ بھی بتایا کہ سکھوں کی کتابوں میں لکھا ہوا ہے کہ اکبر، جو اس دور میں ہندوستان کا بادشاہ تھا نے اس راستہ سے گزرا اور اس نے گورورام داس سے ملاقات بھی کی۔ اس بات کا ذکر میں پچھلے صفحات میں کر آیا ہوں کہ کسی نے اکبر کو شکایت کی تھی کہ گرنتھ صاحب میں اسلام کے خلاف باتیں لکھی ہوئی ہیں۔ اکبر نے اس کی تحقیق کروائی جس سے یہ ثابت ہوا کہ ایسا کچھ نہیں ہے۔ اس پر اکبر نے انعام بھی دیا تھا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے گولڈن ٹیمپل کی جگہ بھی اکبر نے ہی دی تھی۔ اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اس وقت تک مغلوں اور سکھوں کے درمیان میں کوئی اختلاف نہیں تھا۔

میں نے مہندر جی سے پوچھا کہ آپ کے پانچویں گورو کون تھے؟

انھوں نے کہا کہ پانچویں گورو، گورو ارجن جی تھے۔ جو ایک بہت بڑے سکالر تھے۔ انھوں نے پہلی مرتبہ گورو گرنتھ صاحب کو لکھنا شروع کیا۔ اس کے لیے انھوں نے بہت سی چیزیں اکٹھی کیں اور اسے آدھی گرنتھ صاحب کا نام دیا، یعنی ایک نامکمل کتاب۔ میں نے مہندر جی سے پوچھا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ گورو نانک صاحب نے کوئی کتاب نہیں لکھی تھی؟ انھوں نے جواب دیا کہ جی یہ بات صحیح ہے۔ گورو ارجن صاحب نے ان کی بہت سی باتوں کو گرنتھ صاحب میں لکھا۔ اس وقت گورو نانک صاحب کی باتیں لوگوں کو زبانی ہی یاد تھیں۔

گورو ارجن صاحب کا دوسرا کارنامہ گولڈن ٹیمپل کی تعمیر تھی۔ انھوں نے گولڈن ٹیمپل اس طریقے سے بنوایا کہ اس کے چار دروازے جو مختلف سمتوں میں کھلتے تھے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ کوئی بھی شخص کسی بھی طرف سے داخل ہو سکتا ہے، کسی پر بھی گردواروں میں آنے پر کوئی پابندی نہیں ہے۔

مہندر جی نے یہ بھی بتایا کہ جہانگیر بادشاہ نے گورو ارجن صاحب کو لاہور کے شاہی قلعے میں قید کیا اور بعد میں قتل کر دیا۔ یہ سکھ دھرم سے وابستہ کسی بھی شخص کا پہلا قتل تھا۔ اسی لیے گورو ارجن صاحب کو پہلا شہید گورو کہا جاتا ہے۔ میں یہ جان کر بے حد حیران ہوا اور پوچھا کہ ایسا کیوں ہوا؟ مہندر جی نے بتایا کہ کے بارے میں دو مختلف باتیں کہی جاتی ہیں جو ایک دوسرے سے کافی مختلف ہیں۔

ایک یہ کہ جہانگیر کے ایک بیٹے، جس کا نام مرزا خسرو تھا، نے اپنے والد کے خلاف بغاوت کر دی تھی۔ اس کا گورو ارجن صاحب کے پاس بھی آنا جانا تھا۔ اس نے گورو کے پاس پناہ لی۔ جس کا جہانگیر کو بہت دکھ تھا۔ اسی کی بنیاد پر اس نے گورو ارجن کو ختم کرنے کا فیصلہ کیا۔

کچھ لوگ اسے مذہب سے جوڑتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ جہانگیر نے گورو سے کہا کہ آپ نے جو کتاب لکھی ہے اس میں کئی باتیں اسلام کے خلاف ہیں، آپ انھیں نکال دیں۔ گورو نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ اس بات کا تذکرہ جہانگیر نے اپنی تزک جہانگیری میں بھی کیا ہے۔ اس نے گورو ارجن کے بارے میں لکھا کہ ایک ہندو لوگوں کو غلط تعلیم دے رہا ہے۔ اس لیے اسے ختم کر دینا چاہیے۔ سکھوں کی کتابوں میں اس قتل پر بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں۔

کیا سچ ہے کیا نہیں؟ میرے لیے کچھ بھی کہنا مشکل ہے۔ البتہ ایک بات تو واضح ہے کہ یہی وہ نقطہ آغاز ہے جو مغل حکمرانوں اور سکھوں کے درمیان دیر پا لڑائی کا سبب بنا۔

مہندر جی نے کہا کہ ہمارے چھٹے گورو، گورو ہر گوبند سنگھ تھے۔ انھیں ایک سنت سپاہی کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ انھوں نے پہلی مرتبہ یہ کہا کہ، اس میں کوئی شک نہیں کہ سکھ دھرم امن و آشتی کا دھرم ہے اور ہم جنگوں پر یقین نہیں رکھتے لیکن اگر کوئی ہم پر ہاتھ اٹھائے تو اپنے مال و دولت اور عزت کی خاطر ہتھیار اٹھانے میں کوئی گناہ نہیں ہے۔ انھوں نے سکھوں کی پہلی فوج تیار کی۔ ان کا یہ بھی کہنا تھا کہ یہ فوج کمزور کی خاطر جنگ بھی لڑے گی اور اسے معاشرے کے کمزور طبقے کو تحفظ کا احساس بھی ہوگا۔

سکھوں کی اس سوچ کے پیچھے گورو ارجن جی کا قتل تھا۔ ان کا خیال تھا کہ اگر سکھوں کی کوئی فوج ہوتی تو ان کے گورو کا قتل نہ ہوتا۔ تاریخ کا ایک چھوٹا سا واقعہ ایک بڑے حادثہ کا سبب بن گیا۔

ہمارے ساتویں گورو، گورو ہر رائے تھے۔ انھوں نے زیادہ وقت گرو نانک کی تعلیمات کو پھیلانے میں ہی گزارا اور سکھ فوج سے دور ہی رہے۔ ان کا دور شاہجہاں کا دور تھا۔ وہ دور سکھوں اور مغلوں کے درمیان امن سے ہی گزرا۔

مہندر جی نے بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا کہ ان کے آٹھویں گورو، گورو ہر کرشن تھے۔ جب انھیں گورو بنایا گیا تو ان کی عمر صرف پانچ سال تھی۔ وہ انسانیت کی خدمت پر یقین رکھتے تھے۔ انھوں نے صرف آٹھ سال کی عمر میں وفات پائی۔ ان دنوں چیچک کی وبا پھیلی ہوئی تھی۔ بے شمار لوگ اس وجہ سے مر رہے تھے۔ وہ لوگوں میں گھل مل گئے اور ان کے ساتھ ہاتھ ملاتے جاتے اور ان کی شفاء کے لیے دعا مانگتے۔ اس کام میں انھوں نے اپنی زندگی کی پروانہ کی اور لوگوں کی خدمت کرتے رہے۔ اس دوران وہ خود بھی چیچک کے مریض بن گئے اور صرف تین سال بعد، آٹھ سال کی عمر میں ان کی وفات ہو گئی۔

ان کے بعد بننے والے گورو، گورو تیغ بہادر تھے۔ ان کا دور عالمگیر کا دور تھا۔ سکھ کہتے ہیں کہ جب عالمگیر نے ہندوؤں اور سکھوں کو زبردستی مسلمان بنانا شروع کر دیا تو اس کے خلاف گورو تیغ بہادر نے آواز اٹھائی۔ جس پر عالمگیر نے انھیں سزا دینے کا فیصلہ کیا اور بعد میں قتل کر دیا۔ جب میں نے اس بارے میں جانا تو مجھے معلوم ہوا کہ بہت سے تاریخ دان اس بات سے اتفاق نہیں کرتے۔ ان کا کہنا ہے کہ ہندوستان کی تاریخ میں ایسا بہت کم ملتا ہے کہ مسلمان بادشاہوں نے ہندوؤں یا سکھوں کو زبردستی مسلمان بنانے کی کوشش کی ہو۔ اگر ایسا ہوتا تو دہلی اور اس کے آس پاس کے علاقوں میں مسلمانوں کی تعداد دس فیصد نہیں بلکہ کئی گنا ہوتی۔ ان کے نزدیک عالمگیر دکن کی لڑائیوں میں مصروف تھا۔ جبکہ سکھ پنجاب میں طاقت پکڑ رہے تھے۔ اس خوف کے پیشِ نظر عالمگیر کے مقامی مسلمان گورنروں نے سکھوں کی ابھرتی طاقت کو ختم کرنے کا فیصلہ کیا۔

سچ کیا ہے؟ معلوم نہیں،

لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ گورو تیغ بہادر کا قتل عالمگیر کے دور میں ہوا جس کا ذمہ دار اسے ہی گردانا جاتا ہے۔ اس نے ایسا کیوں کیا انھیں بھی قتل کیا گیا تھا۔

دسویں گورو، گورو گوبند سنگھ ہیں۔ انھی کے دور میں سکھ دھرم میں کئی باتوں کا اضافہ ہوا، جیسے، سنگھ لفظ کا استعمال، خالصہ کا قیام، سکھوں کے پانچ کاف یعنی، کنگھا، کچھا، کیس، کرپان اور کڑا کا آغاز ہوا۔ انھوں نے گرنتھ صاحب کو گورو ماننے کا کہا۔ یہ بھی طے کیا کہ اب کوئی گورو نہیں آئے گا اور اس سے سکھ دھرم میں کوئی فرقہ بندی بھی نہیں ہوئی۔

یہ سب جان کر میں نے مہندر جی سے کہا کہ آپ کی باتوں سے مجھے بہت سے سوالوں کے جواب تو مل گئے ہیں، یہ بھی پتہ چل گیا ہے کہ سکھوں اور مغلوں کے درمیان جنگ کا آغاز کیسے ہوا۔ البتہ کچھ سوالات ابھی بھی باقی ہیں کہ اس دور میں ہندوؤں کا کردار کیا تھا؟ مسلمان کیا سوچتے تھے؟ ہندوؤں اور سکھوں کے درمیان ان جنگوں کو ختم کرنے میں کس نے کیا کردار ادا کیا؟ ہمیں باتیں کرتے کافی دیر ہو گئی تھی۔ بس کی روانگی کا وقت بھی ہوا چاہتا تھا۔

میرا دل کر رہا تھا کہ میں سرہند میں کچھ وقت مزید رہوں لیکن ایسا ممکن نہیں تھا۔ میں نے مہندر جی کا شکریہ ادا کیا اور ان سے اجازت لی۔ اس کے ساتھ ہی یہ وعدہ کیا کہ میں انشاء اللہ ان سے رابطے میں رہوں گا۔

ایک بار پھر سرہند سے دہلی کی طرف سفر کا سلسلہ شروع ہوا۔ بچے بھی خوش تھے۔ ان کا خوف بھی کافی حد تک دور ہو گیا تھا۔ خاص طور پر فلوٹنگ ریستوران سب کو بہت ہی اچھا لگا۔

اس سے پہلے کہ میں آپ کو ریاست پٹیالہ اور ریاست نابھہ، جو کہ پنجاب کی تاریخی ریاستیں ہیں کے بارے میں کچھ بتاؤں میں سکھوں کے پانچ کاف سے متعلق بتانا چاہتا ہوں۔

گورو گوبند سنگھ نے سکھوں کو لازمی یہ پانچوں کام کرنے کا حکم کیوں دیا تھا؟اس کے پیچھے جو حکمت مجھے جاننے کو ملی وہ میں آپ کے سامنے رکھنا چاہوں گا۔

سب سے پہلے کیس، یعنی بالوں کا نہ کاٹنا۔ اس کے بارے میں ان کا کہنا تھا ہے کہ ہم یہ چاہتے ہیں کہ جس طریقے سے رب نے ہمیں پیدا کیا ہے اسی طریقے سے رہا جائے لیکن میں نے ایسے کئی سکھ دیکھے ہیں جو بال کٹواتے ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ سکھ دھرم ایمان اور عمل کا نام ہے۔ اس لیے کیس رکھنا ضروری نہیں ہے۔ ایک جگہ میں نے یہ بھی پڑھا کہ تھا سکھ اس لیے بال نہیں کٹواتے کیونکہ اس کے لیے انھیں نائی کے سامنے سر جھکانا پڑتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ ایک مزاحیہ سی بات ہے۔

دوسرے کاف سے مراد کنگھا بھی ہے۔اس سے متعلق جو جانا اس کے مطابق یہ صفائی ستھرائی کے لیے بہت ضروری ہے۔ سکھ کیونکہ بال نہیں کٹواتے اس لیے ان کی صفائی کے لیے کنگھا ضروری ہے۔ میں نے یہ بھی پڑھا کہ ہر سکھ کے لیے ضروری ہے کہ وہ ہر روز صبح بال کھول کر نہائے اور بالوں کو دھونے کے بعد انھیں کنگھی کرے۔ اس لیے کنگھا اس کی زندگی کا ایک الگ حصہ ہونا چاہیے اور ہر وقت اس کے پاس ہونا چاہیے۔

تیسرے کاف سے مراد کڑا ہے۔ ہر سکھ کے لیے لازم ہے کہ وہ پیتل یا لوہے کا کڑا پہنے۔ یہ سونے اور چاندی کا نہیں ہونا چاہیے۔اس سے مراد یہ ہے کہ جیسے کڑے کا کوئی سرا نہیں اسی طرح اس کائنات کے مالک کی بھی کوئی حد نہیں ہے۔ وہ ہر جگہ کا مالک ہے اور اس نے پوری کائنات کو پورے طریقے سے گھیر رکھا ہے اور اس سے دوسری مراد غلامی ہے، جیسے ہم ہاتھ میں ہتھکڑی پہنتے ہیں۔ یہ بھی گورو کی غلامی کا اعلان کرنے کے مترادف ہے۔

چوتھے کاف سے مراد کچھا ہے۔ کچھا سے متعلق دو رائے ہیں۔ ایک یہ کہ جنگ کے دوران کچھے کی وجہ سے جنگ کرنے میں آسانی ہوتی ہے اور اپنی شرمگاہ کی حفاظت ہو

جاتی ہے۔ کچھ لوگوں کا یہ بھی کہنا ہے کچھے سے مراد یہ ہے کہ ہر سکھ اپنی نفسانی خواہشات پر مکمل کنٹرول کرے۔ وہ ایسا کوئی عمل نہ کرے جو بدنامی کا باعث ہو۔ یاد رہے سکھ دھرم میں بھی ایک سے زیادہ شادی کی اجازت نہیں ہے۔

پانچویں چیز کرپان ہے۔جو اس بات کو ظاہر کرتی ہے کہ ہر سکھ اپنی حفاظت اور کسی بھی مظلوم کی مدد کے لیے ہر وقت مسلح ہے اور جنگ کے لیے تیار ہے۔

دوپہر کے کھانے کے وقفے کے بعد اب ہم سرہند سے گزر کر دہلی کی طرف رواں دواں تھے۔ سرہند کے بارے میں، میں نے تفصیل سے پچھلے صفحات میں ذکر کیا ہے۔اب میں ریاست پٹیالہ کے بارے میں چند دلچسپ معلومات آپ کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہوں۔

ریاست پٹیالہ سے اس بناء پر میرا خاندانی تعلق ہے کہ میرے آباؤاجداد اسی ریاست کے رہنے والے تھے لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی اہم ہے کہ ریاست پٹیالہ کئی وجوہات کی وجہ سے بھارت بھر میں ایک منفرد شناخت بھی رکھتی تھی۔ تقسیم ہند کے بعد بھی اس ریاست نے کئی میدانوں میں اپنے آپ کو منوایا۔

اب تک میں نے جتنی بھی ہندوستانی ریاستوں کے بارے میں بات کی ہے ان میں جس ریاست نے تعلیم اور کھیلوں کے میدان میں سب سے زیادہ ترقی کی ہے، ان ریاستوں میں پٹیالہ بھی شامل ہے۔اس علاقے کی تین ریاستیں، جو ساتھ ساتھ موجود تھیں، ریاست پٹیالہ، ریاست جند اور ریاست نابھہ پھولکی ریاستیں بھی کہلاتی تھیں۔ کیونکہ ان سب کے حکمران چودھری پھول سنگھ کی اولاد میں سے تھے۔

اس وقت ہم ریاست پٹیالہ سے گزر رہے تھے۔پٹیالہ شہر ہمارے دائیں طرف تقریباً بیس کلومیٹر کے فاصلے پر واقع تھا۔ ہم اسے دیکھ تو نہ سکے۔ البتہ اس علاقے سے ضرور گزر رہے تھے جو کبھی ریاست پٹیالہ کا ایک اہم شہر تھا۔ ہمارے کچھ فاصلے پر ریاست

نابھہ کا علاقہ بھی موجود تھا۔ ایک مختصر ذکر ریاست پٹیالہ کا جو کبھی میری ریاست بھی تھی۔ جو آج بھی میری پہنچان ہے۔ جب لوگ یہ پوچھتے ہیں کہ آپ کے بڑوں نے کہاں سے ہجرت کی، تو جواب میں کہتا ہوں، کہ "ریاست پٹیالہ سے۔" یہ میرے تعارف کا ایک اہم حصہ ہے۔

ریاست پٹیالہ : ہندوستان میں سکھوں کی پہلی باقاعدہ ریاست

ریاست پٹیالہ کی بنیاد 1763ء میں رکھی گئی اور یہ تقسیم ہند تک قائم رہی۔ یہ ریاست ان ریاستوں میں سے ایک ہے جنھوں نے سب سے پہلے خود کو بھارت میں ضم کیا۔ یہ ریاست ساڑھے پانچ ہزار مربع کلومیٹر پر مشتمل تھی۔ انیسویں صدی کے آغاز میں اس کی آبادی پندرہ لاکھ کے قریب تھی۔ اس کے رقبہ کا اندازہ آپ اس سے کر سکتے ہیں کہ ضلع لاہور کا رقبہ تقریباً سترہ سو مربع کلومیٹر ہے۔ اس کا دارالحکومت پٹیالہ شہر تھا جس کی بنیاد اس ریاست کے بابا اعلیٰ سنگھ نے ہی رکھی تھی۔ اس کا دوسرا اہم ترین شہر سرہند تھا جو صدیوں پرانا شہر ہے۔ اس شہر میں مجدد الف ثانیؒ کا مزار بھی ہے۔

Photo Credit: https://www.indiatoday.in
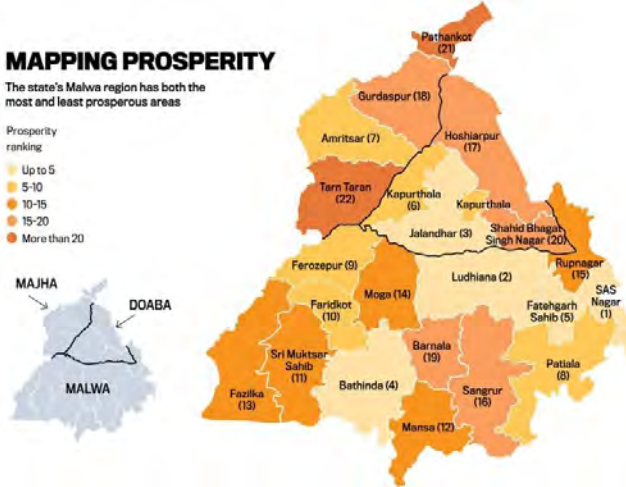
تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ اٹھارہویں صدی میں عالمگیر کی موت کے بعد پنجاب میں سکھوں اور مغلوں کے درمیان لڑائی جاری تھی اور اسی دوران احمد شاہ ابدالی نے پانی پت کی تیسری جنگ میں مراٹھوں کو شکست دی۔ اس کے بعد اس تمام علاقے پر ایسے افغان حکمرانوں کی بالادستی قائم ہو گئی جنھیں دہلی کے حکمرانوں کی حمایت بھی حاصل تھی۔ یہ بھی یاد رہے اس دور میں بابا بندہ سنگھ بہادر نے بھی مغلوں کے ساتھ کی لڑائیاں لڑی۔ اس شہر کے حکمرانوں کا تعلق جسلمیر کے ایک خاندان سے تھا۔ ان کے ایک بڑے محراب سنگھ نے اس علاقے میں اپنے قدم جمائے اور ان کے پوتے موہن سنگھ نے ان کے نام پر ایک شہر محراب پور بھی بسایا اور یہیں اپنا مرکز بھی قائم کیا۔

موہن سنگھ، گورو ہر گوبند کے وفادار ساتھی تھے۔ انھوں نے گورو کا بہت ساتھ دیا اور گورو کے ساتھ مل کر مغلوں کے ساتھ کی لڑائیاں لڑیں۔ اس کا بڑا بیٹا روپ چند ایک جنگ میں مارا گیا۔ اس کے چھوٹے بیٹے نے اپنے بھائی کے بیٹے پھول کی پرورش میں اہم کردار ادا کیا۔ اس کی موت کے بعد پھول نے ایک مضبوط گروہ کی بنیاد رکھی۔ اس کا ایک بیٹا اعلی سنگھ بھی تھا۔

بابا بندہ سنگھ بہادر کی موت کے بعد اعلیٰ سنگھ کو اپنی ریاست قائم کرنے میں خاصی سہولت حاصل ہوئی۔ اس کے لیے انھوں نے خالصہ کی مدد بھی حاصل کی۔ ان تمام جنگوں میں کئی اہم کارنامے سرانجام دینے کے بعد اعلیٰ سنگھ کو اس علاقے میں ایک اہم حیثیت حاصل ہو گئی۔ بابا بندہ سنگھ مارا جا چکا تھا اور سکھوں کو کوئی مرکزی لیڈر میسر نہیں تھا۔ مختلف مثلیں یعنی گروہ قائم ہو گئے تھے۔ اعلیٰ سنگھ نے بھی اپنا ایک گروہ بنا لیا تھا۔ اس نے کچی گڑھی کے نام سے ایک عمارت بنوائی جو اب پٹیالہ شہر کے وسط میں قلعہ مبارک کے نام سے موجود ہے۔

اعلی سنگھ کے بارے میں ہمیں ایک بہت ہی مختلف بات بھی ملتی ہے اور وہ یہ کہ جب احمد شاہ ابدالی اور مراٹھوں کے درمیان لڑائی ہو رہی تھی ، یہ جانتے ہوئے کہ مراٹھا لوگ بڑی دور سے آئے ہیں اور انھیں شکست بھی ہونے والی ہے، اس نے احمد شاہ ابدالی کا ساتھ دیا۔

Baisakhi celebrations.
Photo Credit: Ravinder Ranuguwal

اس بات سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ احمد شاہ ابدالی مغل حکمرانوں کی مدد اور مراٹھوں کا راستہ روکنے کے لیے ہندوستان آیا تھا۔ اس موقع پر ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ تمام ہندو اور سکھ مل کر ابدالی کا مقابلہ کرتے لیکن ایسا نہیں ہوا۔ بلکہ شمالی ہندوستان کے راجاؤں کی اکثریت نے یہ جانتے ہوئے کہ اگر مراٹھے اس علاقے میں اپنے قدم جمانے میں کامیاب ہوگئے تو یہ ان کی ریاستوں کے لیے خطرے کا باعث ہو گا اور یہ بھی انھیں معلوم تھا کہ احمد شاہ ابدالی جیت کر حسب معمول واپس افغانستان چلا جائے گا، اس وجہ سے ان سکھ ریاستوں نے احمد شاہ ابدالی کا ساتھ دیا۔ اس بات سے خوش ہو کر احمد شاہ ابدالی نے اعلیٰ سنگھ کو نا صرف ریاست قائم کرنے میں مدد دی اور اسے مہاراجا کا خطاب بھی دیا بلکہ اسے اپنا جھنڈا بنانے کی بھی اجازت دی۔ اس طریقے سے 1763 ء میں ریاست پٹیالہ کی بنیاد رکھی گئی.

ابدالی کے جانے کے بعد اس کے گورنر کو شکست دے کر اعلیٰ سنگھ نے سرہند کا کچھ علاقہ قبضے میں لے لیا۔ اعلیٰ سنگھ کے زیرِ قبضہ علاقے کو اعلیٰ کی پٹی کہا جانے لگا۔ پنجابی زبان میں پٹی لمبائی کے رخ ایک بڑے علاقے کو کہتے ہیں۔ اعلیٰ کی پٹی بعد میں ریاست پٹیالہ میں تبدیل ہو گئی۔ اسی دور میں پٹیالہ شہر میں قلعہ مبارک کی بنیاد بھی رکھی گئی۔

Raja Ala Singh Founder of Patiala State

Photo Credit: https://www.royalark.net

Patiala Maharjas Photo Credit:
https://srivaishnavabrahmins.wordpress.com
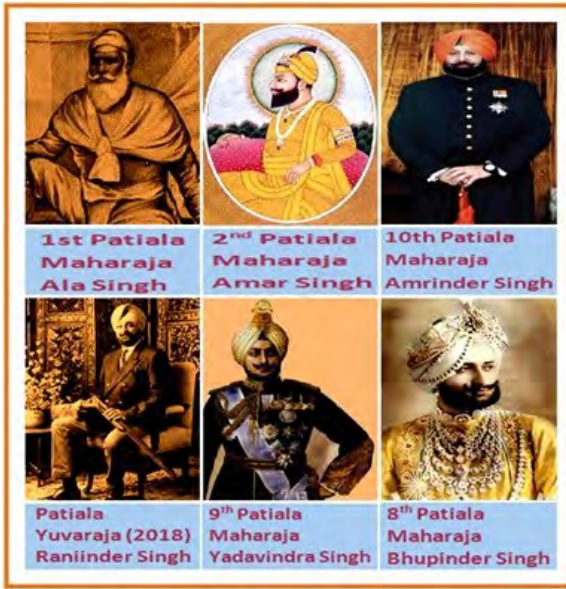
Maha Raja Patila with muslims and British officer

Photo Credit: https://www.sciencephoto.com

اعلی سنگھ جس ریاست کیلیے عمر بھر جنگ کرتا رہا اسے اس کی حکمرانی صرف دو سال ہی نصیب ہوئی اور وہ 1765ء میں اس دنیا سے رخصت ہو گیا. اس کے بعد اس کا پوتا امر سنگھ گدی پر بیٹھا۔

ریاست پٹیالہ کے قائم ہونے کے چند سال بعد رنجیت سنگھ نے پنجاب میں اپنی حکومت قائم کی۔ اب ان چھوٹی چھوٹی ریاستوں کے والیان کو، جن میں ریاست کپور تھلہ، ریاست جند، ریاست پٹیالہ بھی شامل تھیں، یہ خوف پیدا ہوا کہ رنجیت سنگھ کہیں ان کی ریاستوں پر بھی قبضہ نہ کر لے۔ ایسے موقع پر ان سب ریاستوں نے فیصلہ کیا کہ اپنے تحفظ کے لیے انگریزوں سے مدد لیں۔

تاریخ یہ بھی بتاتی ہے کہ ان سکھ ریاستوں کے والیان نے کسی مسلمان کے خوف سے نہیں بلکہ ایک سکھ سردار رنجیت سنگھ سے بچنے کے لیے ایک غیر ملکی قابض کی مدد حاصل کی۔ اس کام کے لیے

ان ریاستوں اور انگریزوں کے مابین 1808ء میں ایک معاہدہ ہوا۔ اس معاہدے کی رو سے یہ طے پایا کہ انگریز ان ریاستوں کو تحفظ فراہم کریں گے۔ یہ ریاستیں انگریزوں کی وفادار ہوں گی۔ جنگ آزادی میں ان ریاستوں نے بطورِ ریاست انگریزوں کا ساتھ دیا۔ انگریزوں نے رنجیت سنگھ کے ساتھ یہ معاہدہ کیا کہ وہ ستلج کے مغربی حصے تک ہی محدود رہے گا۔ یوں ان ریاستوں نے اپنی بقاء کے لیے انگریزوں کی پناہ لی۔

ان ریاستوں نے جب یہ جانا کہ مراٹھوں سے کیسے بچنا ہے تو انھوں نے احمد شاہ ابدالی کے ساتھ دوستی کی اور جب انھوں نے رنجیت سنگھ سے خطرہ محسوس کیا تو انگریزوں کے ساتھ معاہدہ کر لیا تاکہ وہ اپنے آپ کو بچا سکیں۔

اب تک میں نے جو پڑھا ہے اس کے مطابق ہندوستان کی اکثر ریاستوں نے اپنی حفاظت اور بقاء کے لیے کسی نہ کسی غیر ملکی کو ضرور بلوایا ہے۔

ریاست پٹیالہ کے 10 حکمران رہے، جنہوں نے مختلف اوقات میں مختلف کام کیے۔ آج پٹیالہ کو پنجاب کا ایجوکیشنل کیپیٹل کہا جاتا ہے اور کھیلوں کی دنیا میں بھی اس کا ایک اہم مقام ہے۔ پٹیالہ میں بنے ہوئے قلعوں اور محلات کے ساتھ ساتھ بے شمار تاریخی عمارتیں بھی اس شہر کی خوبصورتی اور دلچسپی میں بے حد اضافہ کرتی ہیں۔

اسے رائل سٹی کا نام بھی دیا گیا ہے۔ ہندوستان بھر میں پہلی کار اور پہلا ہوائی جہاز رکھنے کا اعزاز بھی ریاست پٹیالہ کے حکمرانوں کو ہی حاصل ہے۔ ریاست پٹیالہ کے حکمرانوں نے جس انداز سے ہر ابھرتی ہوئی طاقت کے ساتھ تعلقات بنا کر رکھے، وہ اس قابل ہیں کہ ان کا مطالعہ کیا جائے۔

اس موقع پر ایک سکھ خاتون، "بی بی صاحب" کور کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے۔ وہ ایک کم عمر راجا کی بڑی بہن تھیں۔ مراٹھوں نے ریاست پٹیالہ پر حملہ کرنا چاہا۔ سب ان کی طاقت سے خوف زدہ تھے تو ایسے میں صاحب کور جی نے فوجوں کی قیادت کی اور اپنی ریاست کو بچایا۔ اس طرح ہندوستان کی چند بہادر خواتین میں اپنا ایک خاص مقام بنالیا۔

ریاست پٹیالہ نے انگریزوں سے وفاداری کا صحیح حق ادا کیا۔ گورکھوں، سکھوں اور افغانیوں سے جنگوں میں ریاست پٹیالہ نے انگریزوں کا بھرپور ساتھ دیا۔ جنگ آزادی کے دوران بھی یہ ریاست انگریزوں کے ساتھ کھڑی تھی۔

میں یہ بات وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اگر ریاست پٹیالہ سکھوں اور انگریزوں کے درمیان ہونے والی جنگوں میں سکھوں کا ساتھ دیتی تو کبھی بھی انگریزوں کو پنجاب میں قدم جمانے کا موقع نہ ملتا۔

ریاست پٹیالہ نے جہاں احمد شاہ کے ساتھ جنگ میں مراٹھوں کا ساتھ بھی دیا۔ مراٹھا قیدیوں کو چھڑانے کے لیے جرمانا بھی ادا کیا، ایک بڑی رقم دے کر بیس ہزار

ہندوستانی قیدی بھی آزاد کروائے، وہیں پر احمد شاہ کے ساتھ صلح بھی کی، ہندوستان بھر میں پہلی اور آخری مرتبہ اس کے نام کا سکہ بھی جاری کیا، اس سے مہاراجا کا خطاب بھی حاصل کیا اور اس کی مدد سے سرہند کے علاقے پر قبضہ بھی کیا۔

Patiala Coin One Rupee Persian Writings Photo Credit: https://www.ngccoin.com

کب جنگ کرنی تھی اور کب صلح میں فائدہ ہے، یہ سب ریاست پٹیالہ کے سکھ حکمران بخوبی جانتے تھے۔ انگریزوں کی مدد کرنے سے پہلے میں انھوں نے بے شمار مراعات بھی حاصل کیں ان کی فوج میں بھی شریک ہوئے، دنیا بھر میں ان کی خاطر جنگیں بھی لڑیں، کرنل اور پھر جنرل کے خطاب بھی حاصل کیے۔ برطانیہ کے شاہی خاندان کا قرب بھی حاصل کیا۔ ایسا کیسے ہوا؟ یہ سب ان کی سیاسی بلوغت کا نتیجہ تھا۔

تقسیم ہند کے بعد بھی وہ اہم ترین عہدوں پر فائز رہے۔ آخری مہاراجا کے بیٹے کیپٹن امریندر سنگھ پنجاب کے وزیرِ اعلیٰ بھی رہے ہیں۔ یوں یہ خاندان 1763ء سے اب تک حکمرانی کر رہا ہے۔ پہلے تو وہ صرف ایک مختصر علاقے ،یعنی ریاست پٹیالہ تک ہی محدود تھے لیکن اب کئی دہائیوں سے پورے بھارتی پنجاب کے حاکم ہیں۔

اس بات کا اعتراف بھی ضروری ہے کہ ریاست پٹیالہ کے راجاؤں نے اپنی ریاست کو جنگ سے بچا کر سب سے صلح رکھی اور اپنی ریاست کو ایک قابلِ ذکر ترقی دی۔ انھوں نے کالج بنائے، پنجابی یونیورسٹی بھی بنوائی، گاما پہلوان کی سرپرستی بھی کی، موسیقی کی دنیا میں بھی پٹیالہ گھرانہ کسی تعریف کا محتاج نہیں ہے، ایک بڑا سپورٹس کمپلیکس بھی بنوایا، موتی باغ بھی بنوایا گرداوارے اور محلات بھی تعمیر کیے۔ ہندوستان میں ایسا کم ہی ہوا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہاں کی ثقافت، جن میں پٹیالہ پگڑی، پٹیالہ شلوار، اور خواتین کے دیگر لباس بھی شامل ہیں، کو بھی پروان چڑھایا۔

پٹیالہ شہر ان شہروں میں سے ایک ہے جسے دیکھنے کی ہمیشہ سے حسرت رہتی ہے۔

اگر اللہ کو منظور ہوا اور زندگی اور حالات نے ساتھ دیا تو ایک دن ضرور جاؤں گا!

میں نے اس بات کی کھوج لگانے کی کوشش کی کہ تقسیم ہند سے قبل اس ریاست میں مسلمانوں کی تعداد کتنی تھی اور ان کے حالات کیسے تھے؟ اس بارے میں کچھ باتیں تو میں نے اپنے والدین سے سنی تھیں اور کچھ مختلف کتابوں میں دیکھیں۔ ان سب سے مجھے یہ معلوم ہوا کہ ریاست پٹیالہ میں مسلمانوں کی تعداد پچیس فیصد کے قریب تھی۔ سرہند میں مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد آباد تھی۔

جو میں نے اپنے بزرگوں سے سنا، اس کے مطابق ہندوؤں اور سکھوں کے جلوسوں کے موقع پر مسلمان پانی کی سبیلیں لگاتے تھے اور محرم اور عید میلاد النبی کے موقع پر سکھ اور ہندو مسلمانوں کو پانی پلاتے تھے۔ ان کی باتوں سے مجھے یہ بھی علم ہوا کہ ان کے شہر میں کبھی بھی ہندوؤں اور سکھوں کے ساتھ مسلمانوں کا کوئی لڑائی جھگڑا نہیں

ہوا۔ سکھ حکمران بھی اپنی اقلیت کا خیال رکھتے تھے۔ان کے ذاتی ملازمین میں مسلمان بھی شامل تھے۔

اس طرح کا ایک اہم واقعہ بھی میں نے پڑھا کہ راجاکے ہاتھیوں کی خدمت کے لیے مسلمان ملازم ہوا کرتے تھے۔ تقسیم ہند کے موقع پر وہ مسلمان بھی کیمپ میں چلے گئے۔جس پر ہاتھیوں نے کھانا پینا بند کر دیا۔یہ سب دیکھ کر انھیں واپس بلایا گیا اور راجا نے ان کی حفاظت کی ذمہ داری لی۔ میں نے تاریخ میں کوئی ایسی بات نہیں پڑھی جس سے یہ معلوم ہوسکے کہ ریاست پٹیالہ کے سکھ حکمرانوں نے مسلمانوں کے ساتھ کوئی برا سلوک کیا ہو۔

اس وقت پٹیالہ میں ہندوؤں کی تعداد پچاس فیصد سے زائد اور سکھوں کی تعداد چالیس فیصد کے قریب ہے جبکہ مسلمان صرف دو فیصد کے قریب ہیں۔

باقی یا تو مار دیئے گئے یا وہ ہجرت کرکے پاکستان آ گئے۔ایسا کیوں ہوا؟اس پر میں نے پچھلے صفحات میں کافی کچھ لکھا ہے۔

اب دوپہر کے تین بج رہے تھے اور ہمیں گھر سے چلے تقریبا دس گھنٹے ہونے کو تھے اور ابھی بھی ہنوز دلی دور است والی کیفیت تھی۔اردگرد کا ماحول دیکھ کر ہم میں سے اکثر لوگوں کو یہ محسوس ہوا کہ یہ مختلف علاقہ نہیں ہے بلکہ اسی طرح کا ہے جیسے ہم لاہور کے گردونواح میں چھوڑ آئے ہیں۔پٹیالہ اور انبالہ کے درمیان راج پورا کا ایک قصبہ آتا ہے جہاں اب بھی شیر شاہ سوری کی بنائی ہوئی ایک سرائے موجود ہے۔

فرید کوٹ: بابا فرید کے نام کا ایک شہر

ہماری بس میں ہمارے علاوہ بھارت میں رہنے والے چند مسلمان بھی اپنے اہل و عیال کے ساتھ سفر کر رہے تھے جو اپنے عزیز و اقارب سے ملنے پاکستان آئے ہوئے تھے۔ایک صاحب، جن کا نام نصیب احمد تھا، سے میں نے بات چیت شروع کی۔ان سے بات کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ فرید کوٹ کے رہنے والے ہیں اور لاہور میں اپنے عزیز رشتے داروں سے ملنے گئے تھے۔ میں نے ان سے ان کے دورہ پاکستان اور فرید کوٹ کے بارے میں کچھ جاننا چاہا، جس پر وہ راضی ہو گئے۔

میرا پہلا سوال ان کے دورہ پاکستان کے بارے میں تھا۔

میرے سوال کے جواب میں انھوں نے کہا کہ پاکستان میں ہمارے کئی عزیز رہتے ہیں اور یوں ہی ہمارا آنا جانا لگا رہتا ہے۔ جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کہ پاکستان کا ویزا کافی مشکل سے ملتا ہے اور اس پر بھی ہمیں صرف تین سے زیادہ شہروں میں جانے کی اجازت نہیں ہوتی۔ اس سے بڑھ کر جو تکلیف دہ بات ہے وہ پولیس رپورٹنگ ہے۔ پولیس کو رپورٹ کرنے میں بہت سارا وقت ضائع ہو جاتا ہے۔ ایسا تو دونوں طرف ہی ہے۔ لہٰذا ہمارے لیے یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ البتہ بعض اوقات ایک دقت ضرور پیش آتی جب پاکستان کے مختلف ادارے ہمارے عزیز و اقارب سے پوچھ گچھ کرتے ہیں۔ اکثر ایسا نہیں ہوتا لیکن جب بھی ہوتا ہے تو وہ کافی مشکلات لے کر آتا ہے۔

باقی رہی یہ بات کہ پاکستان کیسا لگتا ہے اس میں کوئی دو رائے نہیں ہے کہ پاکستان ایک خوبصورت اور پر امن ملک ہے۔ ہم رات کے کسی بھی پہر نکل جاتے تھے تو بھی کوئی ڈر اور خوف نہیں ہوتا تھا۔ میں یہاں خاص طور پر لاہور کا ذکر کرنا چاہوں گا جو باغوں کا شہر بھی ہے اور خوبصورت بھی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضرور کہوں گا

کہ وہاں صفائی ستھرائی کا بھی اچھا انتظام ہے۔ لاہور اپنی معاشرتی اور سیاسی اہمیت کی وجہ سے بھی دنیا بھر میں جانا جاتا ہے۔

لاہور کی تعریف سن کر مجھے بہت اچھا لگا۔ لاہور ہے ہی ایسا دلکش شہر، جو بھی اسے دیکھتا ہے وہ یہی کہتا ہے کہ لاہور واقعی خوبصورت شہر ہے۔

میں نے اس سے کہا کہ میں فرید کوٹ کے بارے میں کچھ جاننا چاہتا ہوں۔

نصیب احمد صاحب نے بتایا کہ فرید کورٹ لدھیانہ سے 120 کلومیٹر مغرب اور فیروز پور سے چالیس کلومیٹر جنوب مشرق میں موجود ہے۔ اس طرح آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ فرید کوٹ بھارتی پنجاب کے جنوبی حصے میں واقع ہے۔

پاکستان کی سرحد سے اس کا فاصلہ تقریباساٹھ کلومیٹر ہے۔ اس کی آبادی پانچ لاکھ کے قریب ہے۔ ایک طویل مدت تک یہ ریاست فرید کوٹ کا صدر مقام رہا ہے۔ موسم کے لحاظ سے یہ خشک اور گرم علاقہ ہے، بالکل ایسے ہی جیسے آپ کالاہور یا قصور ہو۔

میں نے ان سے پوچھا کہ نصیب صاحب یہ تو بتائیں کہ اس ریاست کا نام فرید کوٹ کیوں رکھا گیا؟ نام سے تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ مسلمانوں کی ریاست تھی۔ کیا ایسی ہی بات ہے؟۔ اس وقت مجھے تک خود بھی اس ریاست کے بارے میں کچھ زیادہ علم نہ تھا۔ مجھے صرف یہ پتہ تھا کہ فرید کوٹ کے نام سے بھی ایک ریاست موجود تھی۔

نصیب صاحب میرا سوال سن کر مسکرائے اور بتانے لگے کہ ریاست کا پہلے نام موکلہار تھا۔ پھر ایک ایسا واقعہ پیش آیا کہ اس کام نام بابافرید گنج شکرکے نام پر رکھ دیا گیا اور یہ سب کچھ ریاست کے ہندو حکمرانوں نے کیا۔ میں نے حیران ہو کر پوچھا کہ کیسے اپنا پرانا موکلہار نام بدل کر ایک مسلمان صوفی کے نام پر ایک پوری ریاست کا نام رکھ دیا؟ ہمیں تو کچھ اس طرح بتایا گیا تھا کہ ہندو مسلمانوں کے بہت سخت دشمن تھے اور تقسیم

پنجاب کے وقت انھوں نے بے شمار مسلمانوں کو قتل بھی کیا تھا۔ یاد رہے بابا فرید تیرہویں صدی میں یہاں آئے تھے اور اس وقت تک سکھ دھرم کا آغاز نہیں ہوا تھا۔

لیکن یہ کیا بات ہوئی؟ یہاں تو معاملہ ہے مختلف ہے۔

اس پر نصیب صاحب نے بتایا کہ یہ ایک بڑا دلچسپ واقعہ ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ یہاں کے راجا نے اپنا محل تعمیر کرنا چاہا اور اس کے لیے ایک بڑی تعداد میں لوگوں کو مزدوری پر لگایا گیا۔ اس دوران بابا فرید بھی اس جگہ سے گزر رہے تھے۔ انھیں بھی حکم ہوا کہ وہ بھی سر پر مٹی کی ٹوکری اٹھا کر کام کریں۔ انھوں نے کام کرنا شروع کر دیا۔ لوگوں نے دیکھا کہ ٹوکری ان کے سر سے اوپر ہوا میں چل رہی ہے۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ ٹوکری لے کر جا رہے ہیں لیکن ٹوکری ان کے سر پر نہیں بلکہ ہوا میں رکھی گئی ہے۔

وہ سب دیکھ کر لوگ بے حد حیران ہوئے۔ راجا کو خبر دی گئی تو وہ بھی بہت پریشان ہوا اور انھوں نے بابا فرید کو اپنے دربار میں بلایا اور ان سے معافی مانگی اور ان سے عرض کی کہ وہ اس ریاست کی خیر خواہی کے لیے یہاں پر کچھ دن قیام کریں۔ اس پر بابا فرید راضی ہو گئے انھوں نے یہاں چالیس دن قیام کیا۔ اس پر ہندو راجا نے ان کی اجازت سے اپنی ریاست کا نام ،جو اس سے قبل اس ریاست کے ایک بزرگ موکلاسی کے نام پر موکلہار تھا ،بدل کر فرید کوٹ رکھ دیا۔

میرے لیے یہ بڑی حیرانی کی بات تھی۔ میرا تعلق ٹوبہ ٹیک سنگھ سے ہے۔ ستر کی دہائی میں ٹوبہ ٹیک سنگھ میں ایک تحریک چلائی گئی تھی کہ اس شہر کا نام ایک سکھ کے نام سے بدل کر دارالسلام رکھا جانا چاہیے۔ وہ تحریک کامیاب نہ ہو سکی۔ اسی طرح میرے ننھیالی گاؤں کا نام کوٹ گورمنگھ سنگھ تھا جسے لوگوں نے بدل کر الہ آباد رکھ دیا۔ پاکستان میں ایسے بے شمار قصبات موجود ہیں جن کے نام ہندوؤں، سکھوں یا انگریزوں

کے نام پر تھے اور انھیں ہم نے بدل کر مسلمانوں کے نام دے دیئے۔ جسکی ایک بہت بڑی مثال لائلپور کا نام بدل کر فیصل آباد رکھنا ہے۔ مسٹر لائل نے اس علاقے کو آباد کیا اور اسی کے نام پر ہی شہر بنا لیکن بعد میں ہم نے شاہ فیصل کے نام پر اس کا نام فیصل آباد رکھ دیا۔

میری حیرانی کو دیکھ کر انھوں نے مزید کہا کہ جو لوگ فرید کوٹ سے پاکستان جانا چاہتے تھے ان کے لیے پر امن طریقے سے جانے کا بندوبست کیا گیا۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ اس علاقے میں قتل و غارت نہیں ہوئی لیکن ایک بات کہی جا سکتی ہے کہ پنجاب کے دیگر علاقوں کی نسبت اس علاقے میں بہت کم قتل عام ہوا۔ پاکستانی سرحد کے قریب ہونے کی وجہ سے یہاں سے اکثر لوگوں نے ہجرت بھی کی۔ اب فرید کورٹ شہر میں صرف ایک فیصد کے قریب مسلمان رہتے ہیں۔

مجھے بابا فرید کے نام کی وجہ سے مزید دلچسپی پیدا ہوئی تو میں نے ان سے پوچھا کہ کیا بابا فرید کے نام کی کوئی اور چیز بھی ہے۔ انھوں نے مجھے خوشی سے بتایا کہ آپ کو یہ جان کر حیرت ہو گی کہ چند سال پہلے فرید کوٹ میں بابا فرید ہیلتھ یونیورسٹی بھی بنائی گئی ہے جو اس شہر کی سب سے بڑی یونیورسٹی ہے۔

میری حیرانی میں بتدریج اضافہ ہو رہا تھا لیکن ایک اہم بات کا جاننا ابھی باقی تھا۔ نصیب صاحب نے بتایا کہ فرید کوٹ میں ایک گردوارہ بھی موجود ہے جس کا نام گردوارہ ٹلہ بابا فرید ہے۔ اس گردوارے میں وہ جگہ بھی محفوظ کی گئی ہے جہاں بابا جی نے بیٹھ کر عبادت کی تھی۔ اس طرح ایک ہی چھت کے نیچے گردوارے اور بابا فرید کے چلے کی جگہ موجود ہے۔

اس سے بڑھ کر مذہبی بھائی چارے کی اور کیا مثال ہو گی!

میں نے اپنے طور پر یہ جاننا چاہا کہ سکھ بابا جی کا اتنا احترام کس وجہ سے کرتے ہیں؟ تو پتہ چلا کہ سکھ دھرم کی کتابوں میں بابا جی بے شمار اشعار ہیں۔ یہ بات بھی بڑی اہم ہے کہ بابا فرید نے لنگر کی روایت کا آغاز کیا تھا جسے بعد سکھوں نے بھی اپنایا—اب ساہیوال میں بھی یونیورسٹی بنائی گئی ہے۔

یہ سب سن کر مجھے یاد آیا کہ میرے والد صاحب جو شعر اکثر گنگنایا کرتے تھے وہ بابا فرید صاحب کے ہی تھے۔ جو کچھ یوں تھے:

اٹھ فریدا سوتیا تو چاڑ ودے مسیت

تو سوتا رب جاگدا تری ڈاڈے نال پریت

ٹریا ٹریا جا فریدا ٹریا ٹریا جا

روکھی سوکھی کھا کے ٹھنڈا پانی پی

ویکھ پرائی چوپڑی نہ ترسایئے جی

ٹریا ٹریا جا فریدا ٹریا ٹریا جا

یہ بات بھی حیران کن ہے کہ بابا فرید نے یروشلم میں بھی کچھ عرصہ قیام کیا۔ ان کے اس قیام کی یاد میں اب بھی وہاں پر ایک سرائے موجود ہے۔ ابھی حال ہی میں بی بی سی نے اس کی ایک فلم بھی بنائی ہے۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ بابا فرید تیرھویں صدی میں یہاں آئے تھے۔

A Palce in a Gurdawar where Baba Farid stayed

Photo Credit: https://www.worldgurudwaras.com

فرید کوٹ سے چند کلومیٹر کے فاصلے پر ایک گوردوارہ گودڑی صاحب بھی بنایا گیا ہے۔اس سے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ اس جگہ پر بابا فرید نے فرید کوٹ میں داخل ہونے سے پہلے آرام کیا تھا اور یہاں اپنی گودڑی ،ایک کمبل نما کپڑا چھوڑ گئے تھے اور اسی کی یاد میں گودڑی کے نام کا گوردوارہ بنایا گیا ہے۔

میرا خیال ہے کہ سکھ بابا فرید سے بے حد محبت کرتے تھے اور یہ چند باتیں اسی کا ثبوت ہیں۔

کچھ باتیں تو انھوں نے بتائیں اور کچھ میں نے بعد میں مختلف جگہ سے اکٹھی کیں۔جو کچھ مجھے پتہ چلا اس کا ایک خلاصہ آپ کی خدمت میں پیش ہے۔

بھارت کی ایک مشہور ویب سائٹ https://www.royalark.net/India/faridkot.htm پر بھارت کی ریاستوں کا احوال لکھا ہوا ہے۔اس کے مطابق فرید کوٹ کے حکمرانوں کے بڑوں نے بارہویں صدی میں جیسلمیر میں ایک ریاست بنائی۔ان کے بڑے بیٹے جس کا نام کپور تھا نے اٹھارہویں صدی کے آغاز میں سکھ دھرم

اختیار کر لیا اور کوٹ کپورا کے نام سے ایک چھوٹی سی ریاست بھی بنائی۔ بعد ازاں خاندانی جھگڑوں کی وجہ سے سردار جودھ سنگھ نے کوٹ کپورا پر قبضہ ر کر لیا اور اس کے چھوٹے بھائی سردار ہامر سنگھ برار نے 1763 ء میں فرید کوٹ کی بنیاد رکھی۔ جب پنجاب میں مہاراجا رنجیت سنگھ کا دور شروع ہوا تو اس نے ان دونوں ریاستوں کو اپنے ساتھ ملا لیا اور اپنے جرنیل دیوان محکم چاند کو اس کا سربراہ بنا دیا۔ اس موقع پر فرید کوٹ کے لوگوں نے انگریزوں سے رابطہ کیا۔ انگریزوں نے ایک معاہدے کے تحت فرید کوٹ کی ریاست اس کے اصل مالکان کو دلوا دی جبکہ کوٹ کپورا ریاست رنجیت سنگھ کے پاس ہی رہی۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ ریاست 1763 ء میں معرض وجود میں آئی۔ ایک دفعہ مغلوب ہونے کے بعد اسے دوبارہ 1809 ء میں انگریزوں کی مدد سے آزادی ملی۔ اس کے بعد سے تقسیم پنجاب تک یہی خاندان حکمران رہا۔ خاندانی لڑائی بھی ہوتی رہی لیکن یہی لوگ اس کے حکمران رہے۔

انگریزوں کی حمایت کے بدلے اس ریاست نے ہر مقام اور ہر موڑ پر مقامی لوگوں کی مخالفت کر کے، خاص طور پر سکھوں کی، انگریزوں کا ساتھ دیا۔ تاریخ کے مطابق راجا وزیر سنگھ نے انگریزوں اور سکھوں کی لڑائیوں میں انگریزوں کا ساتھ دیا۔ اس نے جنگ آزادی میں بھی انگریزوں کی بھرپور حمایت کی۔ اس کے بعد اس کے بیٹے نے بھی انگریزوں کے ساتھ ہر طرح کا مالی اور فوجی تعاون کیا۔

اس کے علاوہ یہ بھی ایک عجیب بات تھی کہ وہ مذہبی رسومات میں سب سے آگے تھے۔ خاص طور پر گولڈن ٹیمپل کی تعمیر میں انھوں نے خاطر خواہ حصہ ڈالا۔ تاریخ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اس ریاست پر انگریزوں نے براہ راست بھی حکمرانی کی۔ ایک وقت آیا جب راجا کا کوئی بیٹا نہیں تھا۔ لہٰذا اس کی بیٹی نے حکومت کی۔

Photo Credit: https://english.newstracklive.com

جنگ عظیم اول میں اس خاتون نے اپنی فوجیں بھی انگریزوں کی ساتھ بھیجیں۔ جس کے بدلے اس ریاست کے راجا کو مہاراجا کا خطاب ملا۔ اس خاندان کے کچھ لوگ باقاعدہ انگریزی فوج میں بڑے عہدوں پر بھی فائز رہے۔ کتنی دلچسپ بات ہے کہ ان دنوں اس ریاست سے نو ہزار سپاہی انگریزوں کی فوج میں شامل تھے جو کل آبادی کا تقریباً پانچ فیصد تھے۔ تقسیم پنجاب کے نتیجے میں پاکستان سے بہت بڑی تعداد میں ہندو اور سکھ نقل مکانی کرکے اس ریاست میں آ گئے اور اس کی وجہ اس ریاست کا پاکستان سے قریب ہونا تھا۔

میں نے پنجاب کی ریاستوں سے متعلق جتنا بھی پڑھا ہے اس میں ایک بات مشترک ہے۔ انھوں نے ہر چڑھتے سورج کو، خواہ وہ افغان ہوں، انگریز یا مراٹھے سلام کیا۔ بطور ریاست کسی نے بھی (سوائے ایک کے جس کا ذکر آگے آئے گا) انگریزوں یا افغانیوں کی مخالفت نہیں کی۔ انھوں نے ہم مذہب سکھوں کے مقابلے میں بھی انگریزوں کی مدد کی۔ انھوں نے وہ سب کچھ ریاست کو بچانے کے لیے کیا، جو کچھ وقت تک بچی رہیں۔ پھر ایک دن وہ سب بھارت میں ضم ہو گئیں۔ ان لوگوں کی ایسی حرکتوں کی وجہ سے بعض لوگ انھیں غدار کا لقب بھی دیتے تھے۔

میں نے آخر میں نصیب صاحب سے پوچھا کہ فرید کوٹ میں مسلمان کس حال میں ہیں؟۔ ان کا جواب تھا کہ ہمیں کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ ہماری مساجد بھی آباد ہیں اور ہم ہر لحاظ سے محفوظ بھی ہیں۔

میں جب یہ تحریر لکھ رہا تھا تو مجھے معلوم ہوا کہ فرید کوٹ سے کانگرس کے امیدوار محمد صدیق نے الیکشن بھی لڑا اور جیتا بھی۔ اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ فرید کوٹ کے لوگ مسلمانوں کو معاشرے میں ایک اہم مقام دیتے ہیں۔ ایک مسلمان کو ٹکٹ دینا اور وہ بھی اس شہر میں جہاں مسلمان دو فیصد سے بھی کم ہوں، نصیب صاحب کی بات کی تائید کرتا ہے۔ اس شہر کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ گیانی زیل سنگھ سابق صدر بھارت، کا تعلق بھی اسی شہر سے تھا۔

اب شام کے چار بج رہے تھے۔ ہمیں بتایا گیا کہ اب ہم کروکیشترا کے پاس پیپلی کے مقام پر آرام کے لیے رکیں گے اور اس دوران ہمیں چائے بھی پلائی جائے گی۔

Photo Credit: Danek Savera

وہ اعلان ہم سب کے لیے انتہائی خوشی کا باعث تھا اور اس کی سب سے زیادہ خوشی مجھے اور عرفان صاحب کو تھی کیونکہ ہم دونوں ہی چائے کے شوقین تھے۔ بچوں کو چائے سے خاص دلچسپی نہیں تھی۔ وہاں پر ہمارا قیام بیس منٹ کا تھا۔ وہ ایک چھوٹا سا ریستوران

تھا۔ حسب معمول جیسے ہی ہماری بس رکی تو ہم نے دیکھا کہ پولیس کے کئی لوگ بس کے ارد گرد آ گئے اور ہمیں ان کے پہرے میں ریستوران جانا پڑا۔

میری زندگی کا غالباً وہ پہلا موقع تھا جب مجھے اس طرح کا سفر کرنا پڑ رہا تھا۔ ایسی صورت حال میرے لیے کچھ زیادہ خوشگوار نہیں ہوتی۔ بہر حال وہ حفاظتی اقدامات جو پاک بھارت تعلقات میں پائی جانے والی کشیدگی کی وجہ سے تھے، ایسا دونوں طرف ہی کیے جاتے ہیں۔

ریاست جند اور سنگرور

میں نے حسب معمول چائے کے دوران ریستوران کے عملے سے بات چیت کرنے کی کوشش کی۔ میں نے نقشے میں دیکھا تھا کہ وہ علاقہ ہریانہ میں شامل ہے اور اس کے جنوب مغرب میں ریاست جند قائم ہے۔ میں نے ریاست جند کا مطالعہ کر رکھا تھا جس سے مجھے بہت ہی دلچسپ معلومات حاصل ہوئیں تھیں۔ اس ریاست کو ریاست جند اور سنگرور بھی کہا جاتا تھا لیکن اب تک مجھے اس ریاست سے تعلق رکھنے والے کسی صاحب سے ملنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ سنگرور اپنے مختلف نام کی وجہ سے کافی جانا پہچانا جاتا ہے۔

اتفاق سے ریستوران کے مینجر (جن کا نام تو میں نہ جان سکا) کے بارے میں مجھے یہ معلوم ہوا کہ ان کا تعلق سنگرور سے ہے۔ میں ان سے اس مختصر وقت میں سنگرور اور ریاست جند سے متعلق چند باتیں ہی پوچھ سکا۔

انھوں نے مجھے بتایا کہ ریاست جند اور سنگرور، دو نام ہونے کی وجہ یہ ہے کہ پہلے اس ریاست کے راجا جند میں رہتے تھے جو کروکیشترا شہر کے جنوب مغرب میں ستر کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے اور اس کا پانی پت سے فاصلہ پچاس کلومیٹر ہے۔ اب یہ علاقہ

ہریانہ میں شامل ہے، بعد میں وہ سنگرور میں چلے گئے۔ سنگرور پٹیالہ کے مغرب میں تیس کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے اور اب پنجاب کا حصہ ہے۔اس طرح ریاست تقسیم کر کے دو مختلف صوبوں کو دے دی گئی۔

میں نے پہلے بھی اس بات کا ذکر کیا ہے کہ اس علاقے میں چودھری پھول سنگھ کی اولاد نے تین مختلف ریاستیں یعنی ریاست پٹیالہ، ریاست جند اور ریاست نابھہ قائم کی تھیں۔ پھول سنگھ کی وجہ سے انھیں پھولکی ریاستیں بھی کہا جاتا ہے۔

This right hand drive example was purchased in 1938 for 5,000 Rupees by the Maharajah of Jind in Haryana, Photo Credit: https://www.team-bhp.com

انھوں نے مجھے مزید بتایا کہ سنگرور پنجاب کا ایک اہم شہر ہے جس کی آبادی تقریبا ایک لاکھ ہے۔ یہاں پر سکھ اکثریت میں ہیں جن کی تعداد پچاس فیصد سے زائد ہے یہاں چالیس فیصد کے قریب ہندو رہتے ہیں اور تقریبا تین فیصد مسلمان آباد ہیں۔ میں نے ان سے پوچھا کہ تقسیم ہند سے قبل یہاں پر مسلمان کتنی تعداد میں رہتے تھے؟ انھوں نے بتایا کہ تقسیم سے پہلے تقریبا بیس فیصد سے زائد مسلمان اس شہر میں رہتے

تھے۔ تقسیم ہند کے وقت ان کے ساتھ بہت ظلم و زیادتی ہوئی۔ اس علاقے میں بے حد قتل و غارت ہوئی اور بیشتر مسلمانوں کو یہاں سے نقل مکانی کرنا پڑی۔

میں نے اٹھنے سے پہلے ان سے سوال پوچھا کہ آپ کی عمر بھی تقریباً پچاس سال کے قریب ہے اور تقسیم ہند کے واقعے کو گزرے ساٹھ سال ہونے کو ہیں، یقیناً آپ کو بھی اپنے بڑوں سے تقسیم پنجاب کے واقعات سننے کا موقع تو ملا ہوگا۔ انھوں نے کہا ہاں میں نے اپنے بزرگوں سے بہت ساری باتیں سنی ہیں۔

میں نے پوچھا کہ آپ کا کیا خیال ہے کہ ایسا کیوں ہوا؟ صدیوں سے ایک علاقے میں رہنے والے لوگ جو ذات برادری میں بھی ایک تھے، ہم دھرم تو بدل سکتے ہیں لیکن ذات تو نہیں بدل سکتے۔ یہ کیا بات ہوئی کہ لوگوں نے ذات برادری، ایک جیسی زبان، ایک جیسا رہن سہن، صدیوں کے تعلقات، سب بھلا کر صرف مختلف مذہب کی بنیاد پر لوگوں کو اتنی شدت سے قتل کر کے اور انھیں دربدر کیا، اس کی مثال نہیں ملتی، اس کی کیا وجہ تھی؟ مقامی لوگ، ہندو اور سکھ مسلمانوں کے خلاف کیوں ہوئے؟

انھوں نے بتایا کہ جو میں نے سنا یا سمجھا ہے اس کے مطابق ایک بات واضح ہے کہ اس علاقے کے سکھ حکمران مسلمانوں سے اس علاقے کو خالی کروانا چاہتے تھے تاکہ بعد میں انھیں حکمرانی کرنے میں کوئی دقت پیش نہ آئے۔ اس کے لیے انھوں نے بدمعاش لوگوں کی بھی مدد لی۔ تاکہ یہ الزام ان لوگوں کے سر آئے اور کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ راجا کی پولیس یا فوج نے یہ کام کیا ہے۔

فساد برپا کرنے والوں کو مکمل طور پر آزادی بھی تھی اور حکمرانوں کی طرف سے آشیرباد بھی حاصل تھی۔ اسی لیے تقسیم ہند کے بعد جب امن ہوا تو ان لوگوں کے خلاف کوئی کاروائی نہیں کی گئی، جنھوں نے وہ سب کچھ کیا تھا۔ اس کے برعکس یہ ہوا کہ جن

لوگوں نے قتل و غارت کی اور لوگوں کا مال لوٹا تھا، انھیں عزت دار بنادیا گیا۔ میں نے تو یہ بھی دیکھا کہ جنھوں نے قتل و غارت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، مال و دولت کو لوٹا، عورتوں کی بے حرمتی کی، وہ شہر کے عزت دار اور خوشحال لوگوں میں شامل ہو گئے۔ انھیں سیاسی اور معاشرتی طور پر ایک اہم مقام حاصل ہو گیا تھا۔

ہاں البتہ میں نے یہ بات بھی سنی ہے کہ بے شمار سکھوں اور ہندوؤں نے اس مشکل وقت میں اپنی جان پر کھیل کر مسلمانوں کو پناہ بھی دی تھی لیکن ایسا کرنے والوں کی تعداد بہت کم تھی۔ ایک اور اچھی بات یہ ہوئی کہ تقسیم پنجاب کے بعد کئی سال تک ایک محکمہ موجود رہا جو اغواء شدہ مسلمان عورتوں اور بچوں کو ڈھونڈتا اور انھیں کیمپوں میں پہنچاتا اور پھر پاکستان بھیجنے کا بندوبست کرتا تھا۔

یہ بات کرکے میں نے ان سے اجازت لی اور ہم اپنی بس کی طرف روانہ ہو گئے۔

ریاست جند اور سنگرور، انگریزوں کی ایک وفادار ریاست تھی۔ اس نے یہ وفا کیسے نبھائی، یہ سب تو راجا کے لقب سے ہی ظاہر ہے۔ اس کا خلاصہ پیش خدمت ہے۔

ریاست جند: انگریزوں کی ایک وفادار ریاست

اس بات کا تذکرہ میں پہلے بھی کئی بار کر چکا ہوں کہ پنجاب میں واقع یہ تین ریاستیں ،پٹیالہ ، نابھہ اور جند، پھلکریاں ریاستیں کہلاتی تھیں۔ ان ریاستوں کے ایک بڑے صاحب، جن کا نام بریام تھا، کو 1526ء میں بابر نے چوہدری کا خطاب دیا تھا۔ یاد رہے یہ وہی سال ہے جب بابر نے لودھی کو شکست دی تھی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بریام صاحب نے بابر کی حمایت کی تھی۔ یہ تمام تر معلومات درج ذیل مشہور اور قابل اعتماد ویب سائٹ سے لی گئیں ہیں۔

https://www.royalark.net/India/jind.htm

یہ ایک طرح سے بھارت کی سرکاری ویب سائٹ ہے۔

بریام ہی کی نسل سے ایک صاحب، جن کا نام چوہدری پھول سنگھ تھا، کے بیٹوں نے یہ تین ریاستیں بنائیں تھیں۔ ریاست جند کی بنیاد 1763ء گجپت سنگھ نے رکھی۔ وہ دہلی سرکار کا وفادار تھا۔ جب اس کی ریاست قائم ہوئی، اس وقت دہلی میں شاہ عالم کی حکومت تھی۔ گجپت سنگھ دلی دربار کو مطلوبہ رقم فراہم نہ کر سکا جس کے نتیجے میں انھوں نے اسے اسے قید کرلیا اور رقم ادا کرنے پر گجپت سنگھ کی رہائی ہوئی۔ انگریزوں اور مراٹھوں کے درمیان لڑائی میں اس ریاست نے مراٹھوں کی مخالفت اور انگریزوں کی حمایت کی۔ جس کے بدلے میں انگریزوں نے انھیں ایک بہت بڑے علاقے کی حکمرانی سے بھی نوازہ اور کئی القابات بھی دیے۔ اس کے بعد اس خاندان میں گدی کے لیے بے شمار لڑائیاں ہوئیں جو کافی دلچسپ واقعات سے بھری پڑی ہیں۔ ان کی تاریخ میں کئی ایسی خواتین کا ذکر بھی آتا ہے جو اپنے کم سن بچوں کی وجہ سے نگران تھیں۔ وہاں ایک راجا سروپ سنگھ بھی تھے جنہوں نے ہر لحاظ سے انگریزوں کی مدد کی۔ اس راجا کو وائسرائے ہند تک رسائی حاصل تھی۔ اس کے بعد راجا رنبیر سنگھ اس ریاست کا بادشاہ بنا جس نے ساٹھ سال تک اس ریاست پر راج کیا۔

Jind Fort Photo Credit:
https://ajatwarriorruler.wordpress.com

اس نے دونوں عظیم جنگوں میں انگریزوں کی حمایت کی لیکن اس کے ساتھ ساتھ ریاست کی ترقی میں بھی اہم کردار ادا کیا۔ اس کی وفات تقسیم پنجاب سے صرف دو ماہ قبل ہوئی۔ اس ریاست کے آخری راجا، راجا رجبیر سنگھ صرف دو ماہ تک اس ریاست کے حاکم رہے۔ بعد ازاں یہ ریاست بھی بھارت میں ضم ہو گئی۔ اس ریاست کے حکمران بھی اپنی شاہی طرزِ زندگی کی وجہ سے کافی مشہور تھے۔ انھوں نے بھی اپنی ریاست بچانے کے لیے دیگر ریاستوں کی نقشِ قدم پر چلتے ہوئے ہر لحاظ سے انگریزوں کی غلامی کی۔ ان کی غلامی ہندوستان کی غلامی ثابت ہوئی۔

انبالہ اور دہلی کے درمیان واقع قصبات اور شہروں کا ذکر میں پچھلے صفحات میں کر چکا ہوں۔

دہلی: اب دور نہ تھا

جب ہم دہلی میں داخل ہوئے تو شام ہو چکی تھی۔ مجھے یہ بہت ہی عجیب لگا کہ جب بھی ہماری بس کسی چوراہے سے گزرتی تو سگنلز بند کرکے ہمیں گزارا جاتا۔ ساٹھ کی دہائی کی ایک فلم بھی یاد آ گئی جس کا عنوان تھا، اب دلی دور نہیں۔

Ab Dilli Door Nahin

SEPL

Poster of a film made in 1957
Photo Credit: SEPL Vintage

بس سے اتر کر اور ٹیکسی والوں سے بھاؤ تاؤ کر کے ہم کرول باغ میں موجود اپنے ہوٹل چلے گئے۔ دن بھر کی تھکاوٹ اور ایک نیا ملک جس کے ساتھ ہمارے تعلقات میں کشیدگی بھی پائی جاتی ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ لوگوں سے بات چیت میں اور شکل وصورت میں کوئی فرق بھی نہ ہو۔ یہ دو مختلف صورتیں عجیب ذہنی کیفیت میں مبتلا کر دیتی ہیں۔ میں اور عرفان صاحب ایک ذمہ داری کا بوجھ بھی محسوس کر رہے تھے۔ ہمارے ساتھ بچے بھی تھے، سبھی جوان تھے، انھیں کو روکنا اور کسی ڈسپلن کا پابند بنانا بھی کافی مشکل تھا۔

بہر حال ایسا تو ہوتا ہے ایسے کاموں میں۔

بچے اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے، میں اور عرفان صاحب ایک ہی کمرے میں رہے۔ دہلی میں ہمارا قیام پانچ دن کا تھا جہاں ہمیں آئی آئی ٹی دہلی میں ٹیکسٹائل ڈیپارٹمنٹ کے علاوہ نارتھ انڈین ٹیکسٹائل ریسرچ اسوسی ایشن، جسے عام طور پر نترا کہا جاتا ہے، کے مرکزی دفتر بھی جانا تھا۔ ہم ان ہی کی دعوت پر بھارت آئے تھے۔ انھوں نے ہمارے لیے کئی ٹیکسٹائل ملز کے دوروں کا بندوبست بھی کیا ہوا تھا۔ ایک دن ہم نے دہلی کے اہم مقامات کی سیر کی۔ ہم آگرہ بھی گئے۔ وہاں پر ایک دلچسپ واقع بھی پیش آیا ۔ اس وقت روٹری کلب سے بھی میرا تعلق تھا۔ روٹری کلب دہلی نے ہمارے لیے ایک پروگرام کا بندوبست کیا بھی تھا، جو کافی دلچسپ تھا۔

نارتھ انڈیا ٹیکسٹائل ریسرچ اسوسی ایشن

اس سے پہلے کہ میں آپ کو اس ادارے سے متعلق بتاؤں کہ کس طرح تقسیم ہند کے بعد بھارت نے ٹیکسٹائل کے لیے ریسرچ کے ادارے قائم کیے، میں اس کی ایک مختصر جھلک آپ کے سامنے رکھنا چاہتا ہوں۔

تقسیم ہند کے وقت پاکستان اور بھارت میں جو چند انڈسٹریز قائم تھیں ان میں ٹیکسٹائل انڈسٹری سرفہرست تھی۔ تقسیم ہند سے قبل بھی ہندوستان سے ٹیکسٹائل کی مصنوعات خاص طور پر کاٹن، اور سوتی کپڑا، برطانیہ کو برآمد کیا جاتا تھا۔ تقسیم کے نتیجے میں ٹیکسٹائل کی بڑی ملز بھارت کے حصے میں آئیں۔ پاکستان میں صرف پنجاب میں ہی دو بڑی ٹیکسٹائل ملز تھیں؛ ایک لائل پور کاٹن مل، لائل پور میں اور دوسری اوکاڑہ کاٹن ملز، اوکاڑہ میں۔ ان دونوں کے مالکان ہندو تھے جو تقسیم ہندوستان کے بعد یہاں سے چلے گئے۔ اس کی کیا وجہ تھی؟ سوائے ڈر اور خوف کے اور کچھ نہ تھا۔

تقسیم سے قبل لائلپور میں ساٹھ فیصد سے زائد ہندو اور سکھ رہتے تھے اور اب ان کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے۔ جان اور مال کے عدم تحفظ کے سوا کوئی اور وجہ نہیں ہو سکتی کہ اتنی بڑی تعداد میں یہ لوگ لائل پور سے نقل مکانی کرنے پر مجبور ہو گئے، جبکہ ابھی پچاس سال پہلے ہی یہ لوگ لدھیانہ، ہشیار پور اور جالندھر سے نکل مکانی کر کے اس نئے شہر میں آباد ہوئے تھے۔ انھوں نے پچاس سال کے عرصے میں دوسری مرتبہ نقل مکانی کی۔ لائل پور کاٹن مل تو اب تک کسی نہ کسی شکل میں چل ہی رہی ہے لیکن اوکاڑہ ٹیکسٹائل مل ختم ہو گئی اور اس کی جگہ رہائشی کالونی بن گئی ہے۔ تقسیم کے فوراً بعد سائٹ ایریا کراچی میں پاکستان کی پہلی ٹیکسٹائل مل، ولیکا ٹیکسٹائل ملز، قائم کی گئی۔ اب شاید اس کا نام عثمان ٹیکسٹائل مل ہے۔ ولیکا ٹیکسٹائل ملز کا افتتاح محترم قائداعظم نے ستمبر 1947ء میں کیا۔

میں جو بات یہاں کرنا چاہتا ہوں اس کا تعلق بھارت کے مختلف شہروں میں قائم کیے گئے ٹیکسٹائل ریسرچ اداروں سے ہے۔ اس سے آپ یہ اندازہ کر سکتے ہیں کہ بھارتی حکومت نے ٹیکسٹائل انڈسٹری کی اہمیت کو سمجھتے ہوئے ایک بہت بڑی رقم اس کام کے لیے مختص کی اور اس کے ساتھ ساتھ اس انڈسٹری نے ایسے ادارے قائم کرنے میں

بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ بھارت کی پہلی ٹیکسٹائل مل 1818ء قائم کی گئی تھی، لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکی۔ اس کے بعد 1854ء میں بمبئ سپننگ اینڈ ویونگ کمپنی قائم کی گئی۔ جس سے صحیح معنوں میں ہندوستان میں ٹیکسٹائل ملز کاآغاز ہوا۔

بھارت کی سب سے پہلی احمد آباد ٹیکسٹائل انڈسٹریز ریسرچ ایسوسی ایشن کا قیام عمل میں لایا گیا۔ جسے ،اتیرا، بھی کہا جاتا ہے۔ اسکے بعد 1954ء میں ساوتھ انڈیا ٹیکسٹائل انڈسٹریز ریسرچ ایسوسی ایشن کا قیام عمل میں لایا گیا۔ جسے ،سترا، بھی کہتے ہیں۔ یہ جنوبی ہندوستان میں یہ ادارہ مختلف ٹیکسٹائل ملز مالکان نے مل کر بنایا۔ 1970ء کی دہائی میں دنیا بھر میں مصنوعی ریشے، خاص طور پر پولیسٹر کے دور کاآغاز ہوا۔ بھارت میں اس کام کے لیے سورت میں MAN-MADE TEXTILES industry research association ایک ادارہ 1956ء میں قائم کیا گیا ہے جسے منترا بھی کہا جاتا ہے۔ اسی طرح کا ایک اور ادارہ بھی قائم کیا گیا جسے بترا کہتے ہیں۔ اس کا پورا نام THE BOMBAY TEXTILE RESEARCH ASSOCIATION ہے۔

نترا کا قیام 1974ء میں عمل میں آیا جس کے لیے بھارتی حکومت نے دہلی کے قریب غازی آباد میں پچاس ایکڑ جگہ دی جہاں بہت ساری عمارتیں تعمیر کی گئیں۔ بارہ سو سے زائد ٹیکسٹائل انڈسٹریز اس کی ممبر ہیں۔ جب ہم 2005ء میں اس ادارے میں گئے تھے تو اس وقت اس میں ساٹھ پی ایچ ڈیز کام کر رہے تھے۔ بھارت کی ٹیکسٹائل انڈسٹری کو آگے پہنچانے میں ان تمام اداروں کا بے حد اہم کردار ہے۔ اب کیا صورت حال ہے، معلوم نہیں۔

ہمارا پہلا دورہ نترا کا تھا۔ بھارت جانے کے لیے ہم نے اسی ادارے سے رابطہ کیا تھا اور ان کی دعوت پر ہی ہمیں ویزے ملے تھے۔ یہ ایک سرکاری ادارہ تھا اور ہم بھی ایک

یونیورسٹی کی طرف سے ہی جا رہے تھے اس لیے ویزوں میں کوئی دقت نہیں ہوئی اور نہ ہی ہمیں پولیس کو رپورٹ کرنا پڑی۔ ہمیں اس ادارے کے سربراہ، جن کا تعلق جنوبی ہند سے تھا، سے بھی ملنے کا موقع ملا۔ وہ ایک انتہائی دلچسپ شخصیت تھے۔ وہ ہمیں شام کے کھانے پر بھی لے کر گئے۔ انھوں نے اپنے سٹاف کے ساتھ بھی ہماری ایک نشست رکھی۔اس نشست میں ہمیں ایک دوسرے سے باتیں کرنے کا موقع بھی ملا۔

AT NITRA Dehli

NITRA Ghazi Abad Photo Credit:
https://collegedunia.com

ہم نے ادارے کے مختلف شعبہ جات کا بھی دورہ کیا۔ ادارے کے سربراہ کے نام کا پہلا حصہ راؤ تھا۔ اس وقت تک میرا خیال تھا کہ راؤ صرف شمالی ہندوستان میں ہی رہتے ہیں لیکن ان سے مل کر پتہ چلا کہ جنوبی ہندوستان میں راؤ حضرات ایک کثیر تعداد میں رہتے ہیں اور ان کا جنوبی بھارت کے معاشی اور معاشرتی میدان میں بھی بے حد اہم کردار ہے۔

ان کی ایک عادت ایسی تھی جو میں آج تک کسی اور میں نہ دیکھ سکا۔ انھوں نے بتایا کہ وہ روزانہ ایک سو سگریٹ پیتے ہیں جو کہ ایک بڑی تعداد ہے، لیکن دلچسپ بات یہ بھی کہ وہ اپنے دفتر میں صبح نو بجے سے شام پانچ بجے تک کوئی سگریٹ نہیں پیتے۔۔۔ یہ ایک انتہائی منفرد بات تھی۔ اس کے بعد بقیہ سولہ گھنٹوں میں وہ ایک سو سگریٹ پی جاتے تھے۔

ایسے لوگوں تو ماچس کی بھی کوئی ضرورت نہیں ہوتی ہو گی!

In a Textile Mills Dehli

AT NITRA Dehli

With Mr. Rao Girector General NITRA Dehli

At NITRA HO Dehli

انھوں نے ہمیں یہ بھی بتایا کہ اس وقت ، یعنی 2005ء میں دہلی میں سرعام سگریٹ پینے پر پابندی تھی۔ پکڑے جانے پر ایک ہزار روپیہ جرمانہ تھا۔ اب کیا صورت حال ہے، معلوم نہیں۔ میں نے سری لنکا میں بھی یہی قانوں دیکھا تھا۔

اب تک جو میں نے لکھا ہے اس آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ بھارت نے ریسرچ اینڈ ڈویلپمنٹ کی اہمیت کو جانتے ہوئے شروع میں ہی جہاں ملک بھر میں آئی آئی ٹی کے نام سے یونیورسٹیز بنائیں وہیں پر ٹیکسٹائل ریسرچ کے ادارے بھی بنائے۔ ایسے ادارے دیگر شعبوں میں بھی ہوں گے جن کا مجھے علم نہیں ہے۔ ان اداروں کو بنانے میں جہاں بھارتی حکومت نے آگے بڑھ کر اپنا کردار ادا کیا وہیں مقامی ٹیکسٹائل انڈسٹری نے بھی مکمل سپورٹ فراہم کی۔

یہاں پر میں آپ کو ایک دلچسپ بات بتانا چاہتا ہوں۔

بیسویں صدی کے آغاز میں جب دنیا میں کپڑے کی مصنوعات بنانے کے لیے اسی فیصد سے زائد کپاس ہی استعمال کی جاتی تھی تو اس وقت مانچسٹر میں کپاس سے مصنوعات بنانے کی ملز لگی ہوئیں تھیں۔ ہندوستان سے کپاس، دھاگہ اور کپڑا برآمد کیا جاتا تھا۔ اس دور میں کپاس کی پیداوار کو بہتر کرنے کے لیے 1923ء میں انگریزوں نے انڈین کاٹن سیس کا ایک ایکٹ بنایا۔ یہ ایک طرح کا ٹیکس تھا جو تمام ملز پر ان کی پیداواری صلاحیت کے مطابق لگایا جاتا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ 1980ء میں پاکستان میں یہ ایک روپیہ فی سپنڈل ہوتا تھا۔

پاکستان نے بھی اسی ایکٹ کے تحت 1951ء میں ملز سے یہ ٹیکس وصول کرنا شروع کر دیا۔ اسی آمدن سے 1951ء میں پاکستان سنٹرل کاٹن کمیٹی کا قیام عمل میں لایا گیا۔ اب مجھے علم نہیں کہ اس ادارے کی کیا صورت حال ہے کیونکہ تیس چالیس سال پہلے تو یہ ادارہ کافی فعال تھا کپاس کی پیداوار کے لیے بھی کافی سود مند ثابت ہوا تھا۔

اسی طرح کا ایک ادارہ سنٹرل کاٹن ریسرچ انسٹیٹیوٹ ملتان، 1970ء میں بنایا گیا۔ جس نے زرعی یونیورسٹی فیصل آباد اور ایوب ریسرچ انسٹیٹیوٹ کے ساتھ مل کر کاٹن کی پیداوار کے خاطر خواہ اضافے میں اہم کام سرانجام دیا۔ ان اداروں کا اصل مقصد کپاس کی پیداوار میں اضافہ اور اس کی کوالٹی کو بہتر کرنا تھا۔ کپاس ٹیکسٹائل انڈسٹری کی بنیادی ضرورت ہے۔ یہ ادارے زراعت کے محکمے کا حصہ ہیں۔ لیکن کپاس سے آگے کے مراحل، جن میں سپننگ، ویونگ، فنشنگ، گارمنٹس مینوفیکچرنگ جیسے معاملات کو دیکھنے کے لیے کوئی ادرہ نہیں بنایا گیا۔ میرے رائے کے مطابق اس کے لیے بھی بہت بڑے پیمانے پر کام ہونا چاہیے تھا، جو نہیں ہوا۔

لوگ پاکستان سے بھارت جائیں اور کسی بڑے سینما میں فلم نہ دیکھیں، یہ کیسے ممکن ہے؟ ہمارے ساتھ نوجوان بچے تھے جو کوئی بھارتی فلم کسی بھارتی سینما میں دیکھنے کے لیے بے تاب تھے۔ اس لیے ہم شام کو جلد واپس آ گئے اور پھر وہ فلم دیکھنے چلے گئے اور میں یہ دعا مانگتا رہا کہ جب وہ رات کو دیر سے واپس آئیں تو اللہ کرے انھیں کوئی مشکل پیش نہ آئے۔

اللہ تعالیٰ نے میری دعا قبول کی، بچے اور عرفان صاحب بخیر و عافیت واپس آ گئے۔ اگلے دن ہمارا پروگرام آئی آئی ٹی کے ٹیکسٹائل ڈیپارٹمنٹ میں جانے کا تھا۔ میں آئی آئی ٹی کا تعارف حصہ اول میں کروا چکا ہوں۔

اس سے اگلے دن ہمارا مختلف ملز دیکھنے کا پروگرام تھا۔ اس دوران چند دلچسپ واقعات ضرور پیش آئے جو آپ کی دلچسپی کا باعث ہوں گے۔

بھارتی ملز میں جو مشینری لگی ہوئی تھی وہ سب کی سب تقریباً ان کے اپنے ملک میں ہی بنی ہوئی تھی جبکہ ہمارے ہاں ابھی تک کوئی ایسا ادارہ نہیں ہے جو ٹیکسٹائل کی بہترین مشینری کی بناتا ہو۔ پاکستان نے اپنا دھیان مصنوعات کو بہتر کرنے کی بجائے یورپی اور جاپانی مشینری کو درآمد کرنے کی طرف ہی رکھا۔

اس چیز کا فائدہ بھی ہوا اور نقصان بھی۔ فائدہ یہ ہوا کہ بھارت نے اپنا بہت سارا وقت مشینوں کے بنانے پر لگایا۔ جس سے وہ اپنے ہاں کی بنی مشینوں سے اچھے معیار کی مصنوعات نہ بنا سکے جبکہ پاکستان نے شروع سے ہی یورپی اور جاپانی مشینوں پر مال بنانا شروع کر دیا۔اس طرح بین الاقوامی مارکیٹ میں پاکستان کی مصنوعات بھارت سے کافی بہتر مانی جاتی تھیں، اب بھی صورت حال ایسی ہی ہے۔

تیسرے روز ہمارا دہلی کی سیر کا پروگرام تھا۔ یہ کام میں اپنے پہلے تین سفروں کر چکا تھا، اس لیے میں نے کچھ اور لوگوں سے ملنے کا پروگرام بنایا۔

میں یہاں ٹیکسٹائل ملز کے دورے کے دوران ایک دلچسپ واقعہ اور عمومی رائے سے بھی آپ کو آگاہ کرنا چاہوں گا۔

مل میں پوجا کی جگہ اور گاؤ ماتا

ہم نے جتنی بھی ملز دیکھیں ان کے مالکان کی اکثریت ہندو تھی۔ ہر مل میں دو چیزیں ضرور تھیں۔ایک بالکل ایسے جیسے ہم اپنی ملز میں نماز کے لیے جگہ بناتے ہیں اسی طرح سے مل میں پوجا کے لیے جگہ بنائی گئی تھی اور اس جگہ پر کوئی ہندو پروہت بھی بیٹھا ہوتا تھا۔ دوسری چیز میں نے یہ دیکھی کہ مل کے کسی نہ کسی کونے میں ایک یا دو گائے ضرور کھڑی ہوتی تھیں۔آخر کیوں نہ ہو، گائے ان کے ماتا کا درجہ رکھتی ہے۔

ہمارے ہاں بھی کہیں کہیں ایسا ہی کچھ ہوتا ہے۔ میں ایک دفعہ کراچی میں ایک ٹیکسٹائل مل میں گیا۔ اس کی پانچویں منزل پر بکریاں بندھی ہوئیں تھی۔ مل مالکان کا تعلق میمن برادری سے تھا اور وہ دیوبند مکتبہ فکر سے تعلق رکھتے تھے۔ پوچھنے پر پتہ چلا کہ مالکان کا کہنا ہے کہ بکری پالنا سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ ہم اسی نقطہ نظر سے مل میں بکریاں پال رکھی ہیں۔ میں نے ان کی بات سے متاثر ہو کر اپنی فیکٹری میں

بکریاں پال رکھی ہیں۔ اس طرح کی ایک اور بات بھی ہمارے ہاں مشہور ہے کہ جہاں جانور ہوتا ہے وہاں اللہ کی رحمت ہوتی ہے۔

میں نے ایک ہندو سے پوچھا کہ آپ گائے کو ماتا کا درجہ کیوں دیتے ہیں؟ جواب میں انھوں نے کہا کہ اس کی دو وجوہات ہیں۔ پہلی یہ کہ ہندوستان ایک زرعی ملک تھا اور کاشت کاری کے لیے بیلوں کی ضرورت ہوتی تھی۔ ہمارے بڑوں نے گائے کو ماتا کا درجہ دے کر اس کی حفاظت کا بندوبست کر دیا اور بیل کا گوشت کھانے سے منع کر کے اسے کاشتکاری کے لیے بچا لیا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ جب گوشت کھانا منع ہو گیا تو خوراک کی ضرورت پوری کرنے لیے دودھ کا سہارہ لیا گیا اور گائے کو ماتا بنا کر لوگوں سے کہا گیا کہ گائے ذبح نہ کریں بلکہ اس کا دودھ پئیں ۔ درحقیقت یہ ایک معاشی ضرورت تھی لیکن اسے ایک مذہبی رنگ دے کر معاشی ضرورت کو پوری کرنے کو یقینی بنایا گیا۔

انھوں نے مزید بتایا کہ سب سے زیادہ چھاؤں پیپل اور بڑھ کے درخت کی ہوتی ہے۔ ہندوستان ایک گرم خطہ تھا۔ لوگ سفر کے دوران سائے کی ضرورت محسوس کرتے ہیں، اس لیے یہ دونوں درختوں کو بچانا بھی ضروری تھا۔ انھیں بھی مقدس بنا کر ان کی جڑوں میں چراغ اور بت رکھ کر انھیں بچایا گیا۔ اس طرح مذہب کا استعمال کرتے ہوئے کئی معاشی اور معاشرتی مسائل حل کیے گئے۔ اب جبکہ حالات بدل گئے ہیں لیکن مذہب میں تبدیلی ممکن نہیں، لہٰذا ہماری نئی نسل اب ان چیزوں کا اتنا خیال نہیں رکھتی جتنا لوگ پہلے رکھتے تھے۔

ایک مل مالک نے بہت متاثر کن بات کی جو نہایت بات قابل ذکر تھی۔

ہم اس کی مل میں گئے جہاں ایک طرف بہت بڑی مشینیں دھاگہ بنا رہی تھیں، وہیں پر دوسری طرف ایک بڑے ہال میں بہت سی عورتیں دیسی چرخوں پر ہاتھ سے دھاگہ بنا رہیں تھیں۔ میں نے ان سے پوچھا بھائی یہ کیا معاملہ ہے؟ آپ یہ کام مشینوں سے کیوں نہیں لیتے؟ ان کا جواب سونے سے لکھنے والا تھا۔

انھوں نے کہا کہ آپ کو معلوم ہے دھاگہ بناتے وقت بہت سی کپاس ضائع ہو جاتی ہے۔ جو ہم لوگوں کو بیچ دیتے ہیں جس سے وہ موٹا دھاگہ بنا لیتے ہیں اور اس سے کھیس اور دریاں وغیرہ بنائی جاتی ہیں۔ میں نے سوچا کہ میں یہ کام ان عورتوں سے لوں جو مشینوں پر کام نہیں کر سکتیں، ان کی عمر بھی زیادہ ہوتی ہے۔ اس طرح انھیں روزگار بھی ملے گا اور وہ مصروف بھی ہو جائیں گی اور کام بھی ہو جائے گا۔ میں اپنی کپاس کی ویسٹ بیچتا نہیں ہوں، بلکہ اسے یہاں لے آتا ہوں اور پھر ان عورتوں سے پرانے ہاتھ سے چلنے والے چرخوں کی مدد سے دھاگہ بنواتا ہوں۔

میں یہ تو نہیں کہتا کہ یہ کام مجھے بہت نفع دیتا ہے البتہ یہ ضرور کہوں گا کہ اس سے مجھے کوئی نقصان نہیں ہوتا۔ اصل فائدہ یہ ہے کہ میں نے سینکڑوں عورتوں کو روز گار مہیا کیا ہے۔ وہ گھر بیٹھ جانے کی بجائے کچھ کام کر لیتی ہیں اور اس سے ان کی کچھ آمدن بھی ہو جاتی ہے۔ ہنس کر کہنے لگے اس سے ساس بہو کے جھگڑے بھی کم ہو جاتے ہیں اور آمدن کی وجہ سے انھیں گھر میں عزت سے بھی رکھا جاتا ہے۔

وہاں اسی طرح کا ایک اور دلچسپ واقعہ بھی پیش آیا جو اس سے کافی مختلف تھا۔

بھارتی صحافی سے ایک مکالمہ

ہم ایک مل کے مالک کے پاس بیٹھے تھے تو دو صاحب آئے جنہوں نے کہا کہ وہ صحافی ہیں اور اپنے اخبار کا نام بھی بتایا۔ انھوں نے مجھ سے پوچھا کہ جب ہماری تہذیب و تمدن ایک جیسا ہے، زبان بھی ملتی ہے، ہم صدیوں سے اکٹھے رہ رہے تھے اور امن بھی تھا، پھر یہ کیا بات ہوئی کہ بٹوارہ کیا گیا؟ اب یہ حالت ہے کہ ہم ہمسائے ہونے کے باوجود تجارت کی بجائے جنگ کو ترجیح دیتے ہیں، محبت کی بجائے دشمنی کا ماحول پیدا ہو گیا ہے؟ یورپ اور امریکہ سے تو تجارت کرتے ہیں لیکن آپس میں نہیں؟ پاکستان کے کپڑے کی

یہاں بے حد مانگ ہے لیکن ہم اسے پاکستان سے منگوا نہیں سکتے؟ ہمارے بچے یورپ اور امریکہ پڑھنے جاتے ہیں یہاں ایسا کیوں نہیں ہوتا؟

ہماری کتابوں، اور رسائل پر بھی پابندی ہے۔ آپ کے ڈرامے اور فلمیں یہاں پر دکھانے کی ممانعت ہے۔ یہ سب کچھ بٹوارے کی وجہ سے ہوا۔ سارے مسائل کی جڑ بٹوارہ ہی ہے۔ ایک طویل بات کرکے انھوں نے کہا کہ آپ کا اس بارے میں کیا خیال ہے؟

میں نے جواب دینے سے پہلے ان سے عرض کی کہ میں نے آپ کی بات تحمل سے سنی ہے آپ کو بھی میری بات مکمل سننا ہوگی اور اس کے بعد آپ جواب دینے چاہیں تو میں اس کے لیے حاضر ہوں۔ میں نے کہا میں اپنی بات کا آغاز ماضی سے کروں گا۔

سب سے پہلے تو اس غلط فہمی کا ازالہ ہونا چاہیے کہ ہندوستان کبھی ایک ملک تھا۔ آج تک کوئی ایسا حکمران نہیں گزرا جس نے آسام اور بنگال سے لے کر بلوچستان اور صوبہ سرحد تک، شمال میں کشمیر، گلگت اور تبت تک اور جنوب میں بحر ہند تک حکومت کی ہو۔ زیادہ سے زیادہ آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ شمالی ہندوستان میں اپنی حکومت مضبوط کرنے کے سو سال بعد مغل حکمران شاہ جہاں کے دور میں گجرات تک ضرور گئے تھے لیکن وہ بھی بہت تھوڑی دیر کے لیے گئے تھے۔ جیسے ہی عالمگیر کی موت ہوئی تو مغلیہ سلطنت کے اکثر صوبے داروں نے اپنی آزاد ریاستوں کا اعلان کر دیا۔ انگریز بھی اس خطے میں آئے اور ان کی حکومت بھی موجودہ ہندوستان اور پاکستان کے ساتھ ساتھ بنگلہ دیش تک کے تمام علاقوں پر پھیلی ہوئی تھی لیکن یاد رہے کہ ان کے دور میں چھ سو کے قریب۔بڑی خود مختار ریاستیں اور جاگیریں موجود تھیں۔ ان ریاستوں کی آبادی اور رقبہ اس وقت کے ہندوستان کا تقریباً نصف تھا۔ اس کا مطلب ہے کہ نصف ہندوستان سے بھی کم علاقے پر

ان کی حکمرانی تھی۔ اس طرح سے یہ کہنا کہ پاکستان کا بننا ہندوستان کی تقسیم ہے، میری ذاتی رائے میں مناسب نہیں ہے۔ ہندوستان پہلے ہی کئی حصوں میں بٹا ہوا تھا۔

اب میں آپ کی اس بات کی طرف آتا ہوں کہ پاکستان کیوں بنایا گیا؟

ہمارا خیال تھا کہ انگریزوں کے جانے کے بعد ہندو اپنی اکثریت کے بل بوتے پر ہمارے ساتھ ظلم و زیادتی کریں گے اور اس کی بنیاد یہ تھی کہ وہ ہمیں اپنے آپ میں سے نہیں سمجھتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ ان کے ہندو بھائیوں کو زبردستی مسلمان بنایا گیا تھا اس لیے اب وہ نہیں دوبارہ ہندو بنائیں گے۔ ایسی سوچ کیوں پیدا ہوئی اس کے لیے ہمیں تاریخ میں جانا پڑے گا۔

ہم پر آپ نے یہ الزام بھی لگایا کہ ہم نے زبردستی ہندوؤں کو مسلمان بنایا۔ میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ دہلی شہر، جس میں ہم اس وقت بیٹھے ہیں، تیرہویں صدی کے آغاز سے انیسویں صدی کے نصف تک، ساڑھے چھ سو سال تک، غوری سے بہادر شاہ ظفر تک یہ شہر مسلمان حکمرانوں کا دارالحکومت رہا ہے۔ زبردستی مسلمان بنانا ہوتا تو یقینی طور پر اس وقت یہاں پر سب سے زیادہ مسلمان ہوتے ہیں لیکن آج بھی دہلی میں بارہ فیصد سے زیادہ مسلمان ہیں۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ کسی مسلمان بادشاہ نے کبھی کسی کو زبردستی مسلمان نہیں بنایا۔ اکا دکا واقعات اگر ہوئے بھی ہیں تو ہم بھی اس کی مذمت کرتے ہیں۔ اسلام ہمیں اس طرح کے رویے کی اجازت نہیں دیتا۔

آپ کو یہ بات بھی نہیں بھولنی چاہیے کہ 1526ء سے 1857ء تک تقریباً سوا تین سو سال، کوئی بھی ایسا مغل حکمران نہیں گزرا جس کی فوج اور دربار میں ہندوؤں کو عہدے نہیں دیے گئے۔ اکبر کے دور میں تو ایسی جنگیں بھی ہوئیں ہیں جس میں دونوں طرف ہی ہندو جرنیل اور فوجی تھے۔

ہمیں یہ کہا گیا کہ ہندوستان کی آزادی میں مسلمانوں کا کوئی کردار نہیں۔ میں آپ کو بتاتا چلوں کہ کبھی بھی مسلمان ہندوستان میں پچیس فیصد سے زیادہ نہیں رہے۔ آپ تحریکِ آزادی ہند کو لے لیں یا کالے پانی کی سزا پانے والوں کی فہرست دیکھ لیں، یا پھانسی چڑھنے والوں کی نام پڑھ لیں اور جیلوں میں جانے والے لوگوں کے بارے میں بھی جان لیں تو آپ کو معلوم ہو گا اس فہرست میں پچاس فیصد سے زائد مسلمان تھے۔

پھر ایک وقت آیا جب انگریزوں کے دور میں صوبائی اور مرکزی حکومت بنائی گئی، اس وقت موجودہ پاکستان اور بنگلہ دیش کے علاوہ پورے ہندوستان میں ہندوؤں کی حکومت تھی۔ مرکزی حکومت میں بھی ان لوگوں کی ہی اکثریت تھی۔ اس دور میں ہندوؤں کے سلوک نے مسلمانوں کو یہ سوچنے پر مجبور کیا کہ جن صوبوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے ان صوبوں کو ملا کر ایک الگ ملک بنایا جائے۔ اس کے نتیجے میں مشرقی پنجاب، جس میں ہریانہ بھی شامل تھا، ایک ہی صوبہ تھا، کو پاکستان کا حصہ ہونا تھا لیکن تقسیم ہند سے پہلے مسلمان جن خدشات کا سوچ رہے تھے وہ ظاہر ہونا شروع ہو گئے۔ تقسیم پنجاب اسی بنیاد پر کی گئی مشرقی پنجاب میں ہندوؤں اور سکھوں کی اکثریت ہے جبکہ مغربی پنجاب میں مسلمانوں کی۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ صوبہ پنجاب میں مجموعی طور پر مسلمانوں کی تعداد پچاس فیصد سے زائد تھی اور اسے پاکستان کا حصہ ہونا چاہئے تھا لیکن ایسا نہیں ہونے دیا گیا۔ پھر اس تقسیم کو ضلع کی بنیاد پر کیا گیا۔ اس لحاظ سے ضلع ہشیار پور پاکستان کا حصہ بنتا تھا پھر آپ نے اسے تحصیل کی بنیاد پر کر دیا۔ اس طرح اس ضلع کی ایک تحصیل شکر گڑھ ہی پاکستان کا حصہ بنی۔ ایسا ہی آپ نے فیروز پور کے ساتھ بھی کیا۔

یہی نہیں ہمارے خدشات اس وقت بھی ثابت ہو گئے جب تقسیم ہند کے بعد اثاثہ جات کی تقسیم کا معاملہ پیش آیا۔ جب ملک تقسیم ہوا تو قدرتی طور پر تمام تر اثاثہ جات

بھی تقسیم ہونا تھے۔آپ تاریخ اٹھا کر دیکھ لیجیے کہ تقسیم ہند کے وقت پاکستان کو کتنا حصہ دیا گیا، بلکہ آپ نے تو یہ بھی کہا کہ پاکستان چند دنوں کے لیے قائم ہوا ہے۔ان کے پاس تو کچھ بھی نہیں ہے۔ یہ ملک کیسے چلائیں گے اور یہ بھی آپ کے علم میں ہے کہ مہاتما گاندھی نے بھی پاکستان کے حق میں آواز اٹھائی تھی اور انھیں اسی کی سزا موت کی شکل میں دے دی گئی۔آپ انھیں پاکستان کا پہلا شہید بھی کہتے ہیں۔اور 1948ء میں آپ نے ہم پر جنگ مسلط کر دی اور کشمیر پر زبردستی قبضہ کر لیا جو آج تک جاری ہے۔

آپ کے علم میں ہے کہ ہندوستان کی اکثر ریاستوں میں جہاں جس مذہب کی اکثریت تھی اسی مذہب کے ماننے والے حکران تھے لیکن کچھ ایسی ریاستیں تھی جہاں پر یہ معاملہ نہیں تھا۔ مثال کے طور پر ریاست حیدرآباد میں حکمران مسلمان تھے جبکہ عوام کی اکثریت ہندو تھی۔ مسلمان حکمرانوں نے ہندوستان سے ملنے میں تھوڑی سی ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کیا تو آپ نے فوجی طاقت کے ذریعے ریاست کو قبضے میں کرلیا لیکن کشمیر کا معاملہ اس سے مختلف تھا۔ حکمران ہندو تھے اور مسلمان اکثریت میں تھے۔اس لحاظ سے اس ریاست کے لوگوں کا یہ حق تھا کہ وہ اپنا فیصلہ خود کرتے لیکن ایسا نہیں کرنے دیا گیا۔ کیونکہ آپ نے اپنی فوج بھیج کر اس پر زبردستی قبضہ کر لیا تھا۔

کشمیر کے حکمران اپنے ہم مذہب ہندوؤں کے ساتھ ملنا چاہتے تھے اور انھیں بھارت کی مکمل حمایت بھی حاصل تھی لیکن آپ مجبور ہوگئے اور آپ نے یواین او میں جا کر کہا کہ ہم کشمیر کے لوگوں کو حق خود ارادیت دیں گے۔ حق خودارادیت کی بجائے آپ نے ان پر وہ ظلم و ستم کیا جس کی دنیا میں کہیں اور مثال ملنا ناممکن ہے اور وہ ظلم و ستم اب تک جاری ہے۔

بات ہو سکتی ہے لیکن میں مختصر طور پر آپ سے کہتا ہوں کہ جو قائداعظم کا خدشہ تھا کہ آپ اکثریت کی بنیاد پر ہمیں ہمارا حق نہیں دیں گے اور ہم نے کہا کہ اس

ملک میں دو قومیں بستی ہیں، ہندو اور مسلمان۔ اس لیے ہمیں ایک الگ ملک چاہیے جہاں ہم اپنی مرضی سے رہ سکیں، اس کے لیے ہم نے پاکستان حاصل کر لیا۔

میں اپنی بات ختم کرنے سے پہلے آپ کو بنگلہ دیش کے قیام کی بات بھی بتانا چاہتا ہوں۔ اس بات سے تو کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ ہندوستان نے بطورِ ریاست بنگلہ دیش میں مداخلت کر کے وہاں کے لوگوں کو فوجی تربیت دی، بے انتہا مال و دولت خرچ کیا، میڈیا کے ذریعہ جھوٹا پروپیگنڈا کیا اور مشرقی پاکستان کو پاکستان سے الگ کر دیا اور کہا کہ ہم نے نظریہ پاکستان کو بحر ہند میں غرق کر دیا۔

آپ ایک اور بات بھی سن لیں کہ جس دن آپ نے ایٹم بم کا دھماکہ کیا تو اس دن آپ نے کہا کہ یہ بم پاکستان کے لیے ہے۔ آپ آج بھی دنیا کے ان ممالک میں سے ہیں جو اسلحے پر سب سے زیادہ خرچ کرتے ہیں۔ حالانکہ آپ کے تین اطراف سمندر ہے۔ مشرق میں نیپال اور بنگلہ دیش ہیں، جن سے آپ کو کوئی خطرہ نہیں ہو سکتا۔ شمال میں ہمالیہ پہاڑ، دوسری طرف چین ہے، جس سے آپ بہت بڑی تجارت کر رہے ہیں۔ یہ صرف آپ کی ایک مغربی سرحد ہے جہاں پاکستان موجود ہے۔ آپ پاکستان سے چھ گنا زیادہ فوج لیے بیٹھے ہیں اور کھرب ہا ڈالر دفاع پر خرچ کرتے ہیں۔ آپ ہمارے علاوہ کسی بھی کو اپنا دشمن نہیں سمجھتے اور یہ سب کچھ ہمارے لیے ہی کر رہے ہیں۔ یہ اس بات تصدیق کرتا ہے کہ آپ نے ابھی تک ہمیں تسلیم ہی نہیں کیا۔ آپ کو یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ تقسیم ہند کے بعد جتنے بھی ہندو مسلم فسادات ہوئے، ان سب میں مسلمانوں کا ہی نقصان ہوا۔ میں نے کہا میں اور بھی بہت کچھ کہہ سکتا ہوں لیکن میں اسی پر اپنی بات ختم کرنا چاہوں گا۔

یہ چیز تو تسلیم کرنی پڑے گی کہ ان صحافی بھائیوں نے میری بات کو بہت غور سے سنا، ان کے چہرے کے رنگ تو بدلتے رہے جو یقینی طور پر ان کی سوچ کو ظاہر کر رہے تھے۔

اس سے پہلے کہ وہ مجھے کچھ جواب دیتے مل کے مالک، جو بڑی عمر کے ایک جہاں دیدہ شخص تھے، نے کہا کہ اس سے زیادہ بات نہ کی جائے تو زیادہ بہتر ہے۔ انھوں نے سوال پوچھا آپ نے جواب دے دیا، بس یہ کافی ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ پاکستان اور ہندوستان دو الگ ملک ہیں، یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے، کبھی بھی ان کا ایک ہونا ممکن نہیں۔ ہمیں ماضی کو بھلا کر اچھے ہمسایوں کی طرح رہنا چاہیے۔ دنیا بھر کے غریبوں کی اکثریت ہندوستان اور پاکستان میں ہی بستی ہے۔ کیوں نہ ہم اپنی جدوجہد کا رخ لڑائی کی بجائے اس بات کی طرف کریں اور پھر اس خطے کو سونے کی چڑیا بنادیں۔

اللہ کرے ایسا ہو! میں نے جواب میں کہا۔

کچھ دن بعد ہمارے ایک دوست نے مجھے بتایا کہ اس صحافی نے ایک ہندی اخبار میں آپ کے ساتھ ہونے والی ساری بات چیت کو بہت بڑھا چڑھا کر لکھا ہے۔ جس کا عنوان تھا "پاکستان سے آئے ہوئے ایک پروفیسر کے منہ سے آگ اگلتی باتیں"

اور اسی طرح کے کئی دوسرے القابات سے بھی نوازا گیا۔

تاج محل اور ہمارے بچوں کی ایک شرارت

اس طرح کئی اور چھوٹی چھوٹی باتیں بھی یاد آرہی ہیں لیکن مجموعی طور پر میں یہ کہوں گا کہ ان کے دفاتر سادہ تھے، ان کے لباس بھی عام سے تھے، مہمان نوازی میں بھی بہت زیادہ تردد نہیں تھا۔ سادہ چائے، بسکٹ اور سموسوں کے ساتھ ہماری تواضع کی جاتی تھی لیکن جیسے ہی ہم ان کی مل میں داخل ہوتے تو آنکھیں کھلی رہ جاتی تھیں کہ کس طرح سے انھوں نے جدید ترین مشینیں لگائی ہوئی ہیں اور بہترین انداز سے اپنی مصنوعات بنارہے ہیں۔

میں ایک اور چھوٹا سا واقعہ ضرور پیش کرنا چاہوں گا۔ جس کا تعلق تاج محل سے ہے۔

Taj Mahal Photo Credit: https://urdu.arynews.tv

ہم بچوں کے ساتھ آگرہ گئے۔ مقامی لوگوں کے لیے تاج محل کا ٹکٹ دس روپے کا تھا جبکہ غیر ملکیوں کے لیے دس ڈالر کا ، ہمارے ہاں بھی ایسا ہی ہے۔ کسی بھی سیاحتی مقام پر غیر ملکیوں سے ٹکٹ ڈالر میں لیا جاتا ہے۔ ہمارے بچے پیسے بچانا چاہتے تھے۔ ان میں سے کچھ نے کہا کہ ہماری شکلیں بھی ایک جیسی ہیں، زبان بھی وہی بولتے ہیں۔ سچی بات تو یہ تھی کہ ہمارے بچوں ان کے مقابلے میں کافی گورے چٹے تھے۔ جب کہ وہاں پر اکثر لوگوں کے رنگ سانولے تھے۔ اس لیے ہمارے بچے دور سے ہی پہچانے جاتے تھے۔

نوجوان بچے تھے، انھوں نے شرارت تو کرنی ہی تھی، سو انھوں نے کی۔ ان کا خیال تھا کہ ہم انھیں یہی کہیں گے کہ ہم پنجاب سے آئے ہیں۔

تاج محل کی انتظامیہ بھی کم پڑھی لکھی نہیں تھی۔ ایک بچے نے ہمت کی۔ اس نے کہا کہ میں چندی گڑھ سے آیا ہوں۔ ٹکٹ چیکر نے پوچھا کہ چندی گڑھ کا ٹیلی فون کوڈ نمبر کیا ہے؟ یہ تو اسی کو پتہ ہوگا جو چندی گڑھ کا رہنے والا ہوگا۔ وہ صورتحال دیکھ کر باقی بچوں نے بھی ڈالر میں ہی ٹکٹ خریدا۔

ٹکٹ چیک کرنے والے بھی اس واقعے سے کافی محظوظ ہوئے۔ انھوں نے اس کا برا نہیں منایا بلکہ اسے مذاق کو انجوائے کیا۔ ایک نے کہا کہ اس عمر میں ایسے کام اچھے لگتے ہیں۔ آخر میں انھوں نے ہمیں بہت اچھے طریقے سے تاج محل میں جانے دیا۔

اکبر کا مقبرہ: ایک شاندار عمارت

تاج محل سے کوئی آٹھ کلومیٹر کے فاصلے پر سکندرہ میں مغل بادشاہ اکبر کا مقبرہ ہے۔ ہم تاج محل میں کچھ وقت گزارنے کے بعد سکندرہ کی طرف چل پڑے۔ میں جب پہلی بار وقاص صاحب کے ساتھ آگرہ آیا تھا اس وقت ہم ایک بس میں آئے تھے اس لیے اکبر کا مقبرہ نہ دیکھ سکے۔ اس بار ہم ایک ٹیکسی میں آئے تھے اس لیے سکندرہ جانا ممکن ہوا۔

مغل بادشاہ اکبر کا مقبرہ 1605-1613ء میں اس کے بیٹے جہانگیر نے تعمیر کروایا تھا۔ یہ آگرہ کے نواح میں سکندرہ نامی قصبہ میں 119 ایکڑ رقبہ پر بنایا گیا ہے۔ یہ مقبرہ آگرہ شہر کے مرکز سے آٹھ کلومیٹر شمال مغرب میں، متھرا روڈ واقع ہے۔ یہ بھی اہم ہے کہ مقبرے سے ایک کلومیٹر کے فاصلے پر اکبر کی سب سے بااثر بیوی مریم الزمانی کا مقبرہ بھی موجود ہے۔

اس مقبرے کے ساتھ ایک افسوس ناک واقعہ بھی جڑا ہوا ہے۔ اس واقعہ کے بارے کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ بات صحیح نہیں ہے۔ اکثر تاریخ دان اس کی صحت پر یقین رکھتے ہیں۔ واقعہ کچھ یوں ہے۔

مغل بادشہ اکبر کی موت کے بعد، اس کے بیٹے جہانگیر نے اپنے والد کے مقبرے کی تعمیر کا منصوبہ بنایا اور اسے مکمل کیا۔ اس وقت اس کی تعمیر پر پندرہ لاکھ روپیہ لاگت آئی اور اسے چار سال کے عرصہ میں مکمل کیا گیا۔ پھر وہ وقت آیا جب اورنگ زیب کے دور میں بھرت پور کے جاٹ راجہ رام جاٹ کی قیادت میں مغل حکمرانوں کے خلاف بغاوت پر اتر آئے۔ اس وقت انھوں نے آگرہ قلعہ کے ساتھ ساتھ اکبر کے مقبرے میں توڑ پھوڑ کی، سونا، زیورات، چاندی اور بہت ساتھ سامان لوٹ کر لے گئے، جو نہ لے جاسکے اسے تباہ کر دیا۔ یہاں تک بات تو ایک عام سی بات تھی۔ فاتح ایسا ہی کرتے ہیں۔ جاٹوں نے

اپنے بزرگوں کے ساتھ مغل حکمرانوں کے ظالمانہ رویہ کا بدلہ لینے کے لیے اکبر کی قبر کو کھولا اور اس کی ہڈیاں جلا دیں۔ یہ ایک انوکھا واقعہ تھا۔

اس کے کئی سال بعد ہندوستان کے وائسرائے جارج کرزن نے اکبر کے مقبرے کی وسیع پیمانے پر مرمت اور بحالی کا حکم دیا اور یوں 1905ء میں یہ کام مکمل ہوا۔ لارڈ کرزن نے تاریخی یادگاروں کے تحفظ کے ایکٹ کی منظوری بھی دی جس سے تاریخی عمارتوں کی دیکھ بھال ہونے لگی۔

ہم مقبرہ پہنچے، حسب معمول مہنگی ٹکٹ خریدی اور مقبرہ کے جنوبی گیٹ سے جو سب سے بڑا ہے گیٹ ہے اندر چلے گئے۔ اس گیٹ پر چار سفید سنگ مرمر کے مینار ہیں۔ جو دیکھنے میں تاج محل سے ملتے جلتے ہیں۔۔ مقبرہ کی درمیانی عمارت کا رقبہ سو مربع میٹر سے زائد ہے۔

مین گیٹ سے داخل ہونے کے بعد ایک مناسب فاصلے پر مقبرہ کی اصل عمارت ہے۔ اس عمارت کے دو بڑے مینار ہیں۔ عام طور پر مغلوں کی عمارتوں میں سفید رنگ کا پتھر زیادہ استعمال ہوتا ہے لیکن اس مقبرے کو بنانے کے لیے سرخ رنگ کی ٹائلوں کا زیادہ استعمال کیا گیا ہے۔ البتہ دونوں بڑے مینار سفید پتھر کے بنے ہوئے ہیں۔ اندر جانے کے لیے ایک ہی بڑا دروازہ ہے۔ دیگر مقبروں طرح کی اصل قبر بھی نیچے تہہ خانے میں ہے۔ تاج محل کی طرح یہاں پر انتارش نہیں ہوتا۔ تعمیر کے نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو یہ عمارت تاج محل سے کہیں کم خوبصورت ہے اور چھوٹی بھی ہے۔

ہم بھی اس مقبرہ کے اندر چلے گئے اور ایک عظیم مغل بادشاہ، جس کا دور ہندوستان کا سنہری دور مانا جاتا ہے، جس کے ساتھ سکھوں، ہندوؤں کی زیادہ عداوت بھی نہیں تھی، جس نے مفاہمت کی پالیسی اپنائے رکھی کی قبر پر فاتحہ خوانی کی۔ اکبر نے کوئی پچاس سال

سے زائد عرصہ تک ہندوستان کے ایک وسیع علاقے پر حکمرانی کی۔ اس کی پیدائش سندھ کے ایک دور دراز قلعے میں ہوئی۔ اس وقت اس کا والد ہمایوں شیر شاہ سوری کی وجہ سے اپنا تخت کھو بیٹھا تھا۔ اکبر کی پرورش کابل میں اس کے ننھالی رشتہ داروں کے پاس ہوئی۔ ہمایوں کی موت کے بعد وہ ہندوستان کا بادشاہ بنا۔

Akbar Tomb Photo Credit:
http://double-dolphin.blogspot.com
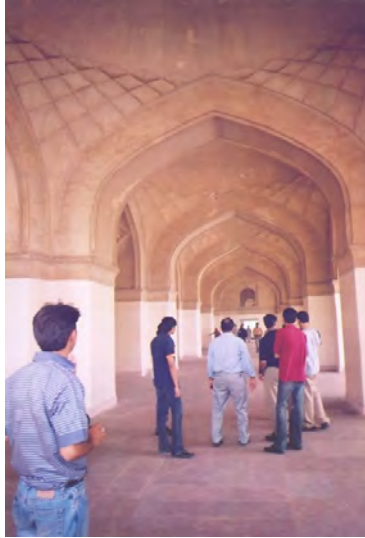
At Akbar Tomb

Mian Entrance of Akbar Tomb

Entrace Gate of Akbar Tomb

روٹری کلب اور ٹوبہ ٹیک سنگھ

میں 2005 ء روٹری کلب لاہور مزنگ کا ممبر تھا اور ہمارے کلب کے صدر الماس جو ئندہ صاحب تھے۔ میں نے ان سے دہلی میں کسی صاحب کا پتہ مانگا جن کا تعلق روٹری سے ہو تاکہ ہم روٹری کلب سے کوئی رابطہ قائم کر سکیں۔ انھوں نے مجھے ایک صاحب کا پتہ دیا جن کے نام کا آخری حصہ تلوار تھا اور وہ روٹری کلب گڑگاؤں کے ایک اہم رکن تھے۔ اس وقت موبائل کا دور دورہ نہیں تھا۔ اس لیے ان سے رابطہ کرنے میں خاصی دقت ہوئی لیکن آخر کار رابطہ ہو گیا۔ ایک دن ان سے وقت طے ہو گیا اور انھوں نے ہم سب لوگوں کو اپنے کلب میں کھانے پر بلایا۔ ہم گیارہ لوگوں کے علاوہ تقریباً بیس لوگ مقامی تھے۔ ہم وقتِ مقررہ پر پہنچ گئے۔ ہم سب کی کوشش تھی کہ ہم شلوار قمیض پہن کر جائیں۔ بچوں کے پاس تو ایسی کوئی چیز نہیں تھی لیکن میرے پاس شلوار قمیض تھی اور میں نے وہ زیب تن کی۔ اس موقع پر کچھ دلچسپ واقعات بھی رونما ہوئے، میں جن کا ذکر کرنا چاہوں گا۔

تلوار صاحب نے بتایا کہ ان کا تعلق جھنگ سے ہے اور مجھے بھی یہ جان کر خوشی ہوئی کیونکہ جھنگ ٹوبہ ٹیک سنگھ ،جو کہ میرا آبائی شہر ہے،سے صرف تیس کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ مدت بعد اس طرح انھیں اپنے علاقے کا کوئی جاننے والا ملا تھا۔

یہ بات میرے لیے بالکل نئی تھی اور شاید آپ میں سے بھی اکثر لوگوں کو اس کا علم نہ ہو۔ تقسیم ہند سے قبل جب یہ بات عیاں ہو چکی تھی کہ پنجاب کی بھی تقسیم ہو گی تو بہت سے اہل خبر نے تقسیم سے پہلے ہی اپنے معاملات سیدھے کر لیے تھے۔ ان میں تلوار خاندان بھی شامل تھا۔ انھوں نے مجھے بتایا کہ 17 جیل روڈ لاہور پر ان کی 17 کنال کی کوٹھی تھی۔ مجھے اب تک یاد ہے کہ ان کے یہی الفاظ تھے ممکن ہے اس میں کوئی بھول چوک ہو لیکن جیل روڈ کی بات درست ہے۔

انھوں نے بتایا کہ ہمارا بہت بڑا کاروبار تھا اور ہمارا دہلی میں بھی آنا جانا تھا۔ حالات کا جائزہ لیتے ہوئے ان کے بڑوں نے دہلی میں ایک کاروباری مسلمان خاندان سے ،جن سے ہمارے پہلے سے تعلقات تھے بات چیت کرکے اپنی جائیداد کا تبادلہ کر لیا۔ تقسیم ہند سے پہلے ہی وہ دہلی آ گئے اور دہلی کا مسلمان خاندان لاہور چلا گیا۔اس طرح دونوں خاندان اجاڑے کے وقت ایک بڑے نقصان سے بچ گئے۔ میرے خیال کے مطابق اس طرح کے کئی واقعات ہوئے، لیکن میرے علم میں بہت کم ہیں۔

میں نے ایک اور بات محسوس کی کہ اس مجلس میں موجود اکثر لوگ پنجاب سے گئے ہوئے تھے۔ ان میں کچھ مشرقی پنجاب سے ،جب اندرا گاندھی کے قتل کے بعد وہاں حالات خراب ہوئے اور کچھ پاکستانی پنجاب سے تھے۔ ہم ابھی بیٹھے ہی تھے کہ کچھ لوگوں نے کہا کہ آپ اپنا تعارف کروائیں کہاں سے ہیں۔

اب جذباتی مناظر شروع ہو گئے !

کیونکہ ان میں سے بہت سے ایسے تھے جو مغربی پنجاب سے گئے تھے۔ایک صاحب نے کھڑے ہو کر اونچی آواز میں پوچھا کہ راولپنڈی سے کون ہے؟۔ہم میں سے ایک نے کہا کہ میرا تعلق راولپنڈی سے ہے، یہ سن کر وہ شخص ہمارے بچے سے ملا اور دیر تک اس سے باتیں کرتا رہا۔ اسی طرح آواز آتی کہ سرگودھا سے کون ہے؟ جب کوئی جواب نہیں آتا، تو اس صاحب کے چہرے پر افسردگی طاری ہو جاتی۔ جب میری باری آئی تو میں نے کہا کہ میں آیا تو لاہور سے ہوں لیکن میرا آبائی شہر ٹوبہ ٹیک سنگھ ہے۔ یہ سن کر ایک صاحب نے پنجابی میں اونچی آواز سے کہا

اوئے ملکا تیرے شہر توں بندہ آیا اے

یہ سنا تھا کہ ایک دبلا پتلا شخص جس کی عمر ساٹھ سال سے زیادہ ہوگی، میرے پاس آیا اور مجھ سے گلے ملا اور دیر تک نم آنکھوں سے مجھے دیکھتا رہا۔جب کچھ حوصلہ ہوا تو مجھے کہنے لگا کہ آپ ٹوبہ میں کہاں رہتے ہیں؟میں نے جواباً کہا آپ بتائیں کہ آپ کا گھر کہاں تھا؟میں پھر آپ کو بتاتا ہوں کہ میرا گھر آپ کے گھر سے کتنی دور تھا۔جواب میں انھوں نے جو بتایا وہ ہمیں مزید قریب لے آیا۔

انھوں نے بتایا کہ غلہ منڈی کے جنوب مشرقی دروازے کے باہر بائیں طرف اگر سٹیشن کی طرف مڑ جائیں تو دائیں طرف ان کا تیسرا گھر تھا۔میں نے انھیں بتایا کہ آپ کے گھر کے پچھواڑے جو گھر لگتا تھا،اس گھر میں میری پیدائش ہوئی تھی۔اب اس گھر میں ایک راؤ خاندان رہتا ہے۔(اس گھر میں رہنے والے راؤ شکیل نے مجھے بتایا کہ اس گھر پر ایک تختی لگی ہوئی تھی جس پر تلسی رام 1937 لکھا ہوا تھا۔)

پھر کیا تھا مزید اداسی طاری ہو گئی۔اتنی دیر میں انھوں نے اپنے بیٹے کو فون کیا اور اس سے اپنے ٹوبہ والے گھر کی تصاویر منگوائیں جو انھوں نے کسی اور سے منگوا کر رکھی ہوئی تھیں جو ان کی اپنے شہر سے محبت کا ایک انداز تھا۔پھر مجھے بتاتے رہے کہ کس طرح سے وہ اس شہر میں رہتے تھے وہ کیسا شہر تھا،ان کے والد صاحب ایک وکیل تھے۔انھوں نے بھی بھارت آ کر وکالت ہی کی۔نقل مکانی کی گفتگو ان کے بس میں نہیں تھی۔جس پر بات کرنے سے انھوں نے کتراتا مناسب سمجھا اور میں نے بھی اصرار نہیں کیا۔

ٹوبہ ٹیک سنگھ میں سکھوں اور ہندوؤں کے لیے جو کیمپ لگایا گیا وہ غلہ منڈی میں ہی تھا جس وجہ سے یہ لوگ قتل ہونے سے بچ گئے۔زیادہ نقصان دیہات میں رہنے والے لوگوں کا ہوا، دونوں طرف یعنی مشرقی اور مغربی پنجاب میں ۔ملک صاحب تو میرے پاس ہی بیٹھے رہے اور اپنے آبائی شہر کا حال پوچھتے رہے۔ تقسیم ہند کے وقت ان کی عمر تقریباً دس سال تھی۔اس وجہ سے وہ اردو پڑھنا لکھنا جانتے تھے۔انھوں نے مجھ

سے کہا کہ آپ نے واپس جا کر مجھے ٹوبہ شہر کی موجودہ تصاویر بھیجنی ہیں، جو میں نے بجھوائیں۔ جس میں ان کے گھر کی تصاویر بھی تھیں۔ انھوں نے بھی ایک بار مجھے خط لکھا جواب تک میرے پاس محفوظ ہے۔

اس محفل میں ایک صاحب ، جن کی عمر ستر سال ہو گی، جو مجھے اب تک بہت اچھے طریقے سے یاد ہیں ، وہ بہت ہی مزاحیہ آدمی تھے۔ ہمارے سارے بچے ان کے ارد گرد بیٹھ گئے اور انھوں نے اونچی آواز میں بچوں کے ساتھ ہنسنا شروع کر دیا۔ وہ دلچسپ باتیں کرتے تھے جس سے بچے ہمارے پاس آنے کا نام تک بھی نہیں لیتے تھے۔

تلوار نے بتایا کہ یہ صاحب ہمارے کلب کے بہت ہی اہم رکن ہیں۔ ان کی خوبی یہ ہے کہ یہ ہم سب کے ذاتی کاموں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔ ہم میں سے کسی کے گھر میں بھی کوئی غمی یا خوشی ہو، ہمیں صرف انھیں اطلاع دینا ہوتی ہے بعد میں کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ ہم نے کیا کرنا ہے۔ یہ ان کا عشق کی حد تک شوق ہے۔ وہ صاحب تقریباً دو گھنٹے تک ہمارے بچوں کے ساتھ رہے، اور کھانا بھی انھی کے ساتھ ہی کھایا۔

معلوم نہیں کہ ان کے پاس ایسی کونسی گیدڑ سنگھی تھی کہ بچے ان کے پاس سے اٹھنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔ دو گھنٹے بعد ہم نے اجازت لی ان صاحب کی آنکھوں میں کافی نمی تھی۔ جاتے وقت انھوں نے کہا کہ آج کی یہ محفل مجھے دیر تک یاد رہے گی۔

اس طرح روٹری کلب کی وجہ سے ہمیں بہت سارے لوگوں سے ملنے کا موقع ملا اور یہ بھی پتہ چلا کہ تقسیم ہند سے پہلے بھی لوگوں نے ہجرت اور نقل مکانی کی تھی۔ یہ وہ لوگ تھے جو حالات کو سمجھتے تھے اور اس کے لیے انھوں نے پہلے سے ہی بندوبست کر لیا تھا اس سے میں یہ مراد لیتا ہوں کہ جہاں تک تقسیم کی بات عام لوگوں کو تو اس کا پتہ نہیں تھا، پتہ چل بھی جاتا تو شاید لوگ یقین نہ کرتے۔ جنھیں پتہ تھا انھیں یقین بھی تھا، انھوں نے اپنے آپ کو بہت بڑے نقصان سے بچا لیا۔

اس واقعہ کو اب سولہ سال ہونے والے ہیں اور مجھے اب تک اس مجلس کی ایک ایک بات یاد ہے۔ اسی طرح ہم روٹری کلب کے ایک اور فنکشن میں بھی گئے جس کے آخر میں سٹیج پر ہلکا پھلکا ڈانس کیا جا رہا تھا۔ وہ کوئی پروفیشنل رقاص نہیں تھے بلکہ عام لوگ ہی تھے۔ ہم میں سے بھی ایک لڑکا اس کام میں کافی ماہر تھا۔ اس نے بھیٔ بہت اچھا ڈانس کیا اور خوب داد سمیٹی۔ اسٹیج سے ہمارا تعارف بھی کروایا گیا کہ ہم پاکستان سے آئے ہیں۔ جس پر سب لوگوں نے کھل کر ہمارا استقبال کیا اور ہمیں ایسا کوئی تاثر نہیں ملا کہ ہم ایک دشمن ملک سے آئے تھے۔

یوں لگتا تھا کہ ریاستی سطح پر ہونے والی دشمنی کا اثر ذاتی سطح بالکل پر نہیں ہے بلکہ ایک تضاد پایا جاتا ہے کہ جو دشمنی ریاستی سطح پر دیکھنے کو ملتی ہے وہ ذاتی سطح پر یا معاشرے میں دیکھنے کو نہیں ملتی۔ عام آدمی کا یہ خیال بھی ہے کہ اگر ہم معاشرتی طور پر ایک دوسرے کے قریب آ جائیں، کاروباری لحاظ سے بھی تعلقات قائم کر لیں اور آنا جانا بھی لگا رہے تو شاید کبھی دونوں ریاستیں اور دونوں طرف کے قائدین عوام کے پریشر میں آکر دشمنی کو دوستی میں بدل لیں۔ یہ ایک اچھی سوچ ہے جو دونوں طرف پائی جاتی ہے۔

اس کا اظہار میں نے بھی کیا لیکن جب پانچ دس سال میں معاشرتی سطح پر ایک اچھا تعلق بنتا ہے تو کوئی ایک واقعہ اسے دوبارہ دشمنی میں بدل دیتا ہے۔ شاید کچھ لوگوں کو یہ دوستی جچتی نہ ہوتی ہو۔ ان کی ذات کو دوستی سے فائدے کی بجائے نقصان ہو سکتا ہو۔ شاید وہ اس دوستی کے نتیجے میں بہت ساری مراعات سے ہاتھ دو بیٹھیں۔

یا شاید کوئی اور بات ہو۔ معلوم نہیں۔۔۔ لیکن دوستی میں کچھ نہ کچھ ضرور آڑے آ رہا ہے!

میں اب تک آپ کے سامنے پنجاب کی مختلف ریاستوں کے بارے میں مختصر طور پر کچھ معلومات پیش کر چکا ہوں لیکن ایک ایسی ریاست بھی ہے جس کے حکمرانوں

نے انگریزوں کے ساتھ دو دفعہ ایک بہت ہی مختلف طرز عمل اختیار کیا، اس کا نام ریاست نابھہ ہے۔ میں اپنے اس سفر کے دوران یہ چاہ رہا تھا کہ مجھے کوئی ایسا شخص ملے جس کا تعلق نابھہ سے ہو تاکہ میں اس سے معلومات حاصل کرسکوں۔ اتفاق سے روٹری کلب کی میٹنگ میں ایک ایسے صاحب سے ملاقات ہو گئی جو نابھہ سے تعلق رکھتے تھے۔ میں نے نابھہ کے بارے میں کچھ معلومات ان سے حاصل کیں اور کچھ دیگر ذرائع سے اس ریاست کے بارے میں جاننے کی کوشش کی اور ان سب کا خلاصہ آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔

نابھہ: ایک ایسی ریاست جس نے کھل کر انگریز کی مخالفت کی اور اس کی سزا بھی

نابھہ ریاست ان تین پھلکیاں ریاستوں میں سے ایک ہے جن کا ذکر میں پہلے کئی بار کر چکا ہوں۔ نابھہ شہر پٹیالہ سے پچیس کلومیٹر کے فاصلے پر شمال مغرب کی طرف واقع ہے۔ یہ اس وقت ضلع پٹیالہ کا ایک حصہ ہے اور اس کی آبادی اسی ہزار کے قریب ہے۔ نابھہ شہر میں کئی تاریخی عمارتیں قائم ہیں یہ شہر دو سو سال سے زیادہ عرصے تک نابھہ کے حکمرانوں کا مرکزی مقام رہا ہے۔ یہاں پر کافی مشہور مندر اور ایک مشہور ہیرا محل بھی ہے جہاں شاہی خاندان رہتا تھا۔

نابھہ کا مطلب اونچی شان والا اور آسمان کی طرح وسیع ہے۔ بھٹنڈا کو پنجاب کا سب سے پرانا شہر مانا جاتا ہے۔ یہ شہر ایک بھٹی راجپوت نے دسویں صدی میں بنایا تھا۔ ریاست نابھہ 1763 سے 1947ء تک قائم رہی۔ اس کا رقبہ 25 سو مربع کلومیٹر کے قریب ہے۔ اس کی آبادی تقریبا تین لاکھ ہے۔ اس کے حکمرانوں کی فہرست دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس ریاست پر کچھ عرصے کے لیے انگریزوں نے براہ راست بھی حکمرانی کی۔ لاہور میں واقع نابھہ ہاؤس بھی اسی ریاست کی ایک نشانی ہے۔

یہ بھی ایک دلچسپ بات ہے کہ ان تینوں ریاستوں نے اپنے دار لحکومت میں ایک قلعہ بنایا اور اس کا نام قلعہ مبارک رکھا۔ ایسا ہی ایک قلعہ پٹیالہ میں بھی ہے۔ نابھہ کے ارد گرد بھی دیوار بنا کر کئی، بڑے گیٹ بنائے گئے۔ 1755ء میں یامر سنگھ نے نابھہ شہر کی نئے سرے سے بنیاد رکھی جو چوہدری پھول سنگھ کی اولاد میں سے تھا۔ اس نے مغلوں کے گورنر زین خان کے ساتھ ایک لڑائی میں بہت سارا علاقہ قبضے میں لے کر نابھہ کے نام پر ہی اپنی ریاست کا نام رکھا۔

اس وجہ سے اس ریاست کی مغل حکمرانوں سے بھی ان بن ہو گئی۔ نابھہ کے حکمرانوں نے مغلوں کے ساتھ ساتھ رنجیت سنگھ سے بھی اپنی ریاست کے تحفظ کے لیے انگریزوں سے اپنے تعلقات استوار کیے اور انگریزوں کے ساتھ ایک معاہدہ کیا۔ جس کی اس ریاست کو بھاری قیمت بھی ادا کرنا پڑی۔ اس سے ایک طرح سے وہ انگریزوں کے غلام بن گئے۔

پھر ایک وقت آیا جب انگریزوں کی سکھوں سے لڑائیاں شروع ہو گئیں۔ ان جنگوں میں نابھہ ریاست کے حکمران راجادیوندرا سنگھ نے سکھوں کا درپردہ ساتھ دیا، جس کا انگریزوں نے بہت برا منایا اور جنگ جیتنے کے بعد راجا کے خلاف سخت کارروائی کی۔ اسے تخت سے اتار دیا اور اس کے سب سے سے بڑے بیٹے کو راجا بنا دیا۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کی بہت ساری جائیداد بھی ضبط کر لی۔ یہ تمام تر معلومات اس ویب سائٹ پر https://www.royalark.net/India/nabha.htm موجود ہیں۔

میرے علم کے مطابق سکھوں اور انگریزوں کی لڑائیوں میں یہ واحد ریاست تھی جس نے کسی نہ کسی حد تک بطور ریاست سکھوں کا ساتھ دیا اور انگریزوں کی مخالفت کی۔ وہ الگ بات ہے کہ انھوں نے اس کی سزا بھی پائی۔ لیکن تاریخ انھیں سنہری حروف سے یاد رکھے گی۔

بعد میں بننے والے راجا نے والد کی عظیم اور قابلِ قدر "غلطی" کو نہیں دھرایا بلکہ انگریزوں کا بھرپور ساتھ دیا۔ 1857ء کی جنگ آزادی میں بھی وہ انگریزوں کے ساتھ کھڑے رہے۔ جس کے بدلے انگریزوں نے انھیں بے حد مراعات بھی دیں اور دیگر انعامات سے بھی نوازا۔

اس ریاست کی تاریخ کافی دلچسپ ہے، یہاں حکمرانی کے لیے کئی جھگڑے بھی ہوتے رہے۔ راجا ہیرا سنگھ، جو ریاست جند کے خاندان سے تھا، کو اس ریاست کا راجا بنایا گیا جس نے اس ریاست کو کافی ترقی دی۔ اس کے دور میں ایک منظّم فوج بھی تیار کی گئی۔ اس کے کردار کو اب بھی اچھے الفاظ میں یاد کیا جاتا ہے۔

بیسویں صدی کے آغاز میں اس ریاست کے حکمرانوں کی پٹیالہ ریاست کے حکمرانوں سے ان بن ہو گئی۔ نابھہ ریاست پٹیالہ ریاست کے مقابلے میں بہت چھوٹی تھی لیکن اس کا ایک کارنامہ نہایت قابل تعریف ہے۔

اس کے راجا شری ریپودامان سنگھ نے جلیانوالہ باغ کی میں کیے جانے والے قتل عام کی سرعام مخالفت کی جو انگریزوں کو بہت بری لگی۔ انھوں نے راجا کو سزا کے طور پر گدی سے اتار دیا اور اسے ریاست بدر کر کے ڈیرہ دون بھیج دیا۔ اسے قتل کرنے کی سازش بھی کی گئی ۔ اور یہ سب کچھ انگریز دشمنی کی وجہ سے کیا گیا۔ راجا ڈیرہ دون میں بھی انگریزوں کے خلاف کام کرتا رہا۔ جس پر اسے مدراس بھیج دیا گیا تاکہ نہ رہے بانس اور نہ بجے بانسری۔
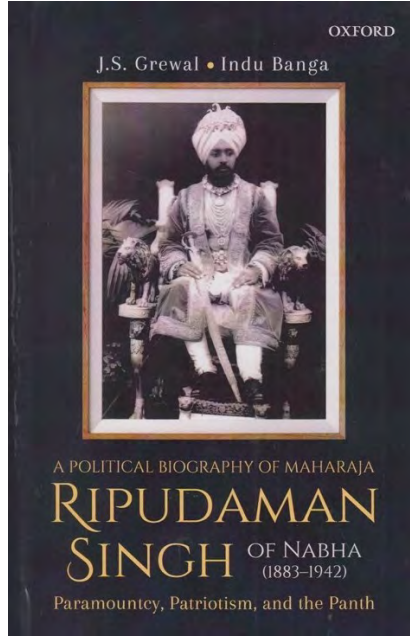
A book about Maharaja Ripudaman Singh Photo Credit: https://www.singhbrothers.com

میرے علم کے مطابق مہاراجہ رپودمن سنگھ آف نابھہ وہ واحد پنجاب کی یک چھوٹی سی ریاست کے والی ہیں۔ جنہوں نے اپنے دور کی سب سے بڑی طاقت، انگریزوں کی مخالفت کی۔ انھوں نے ہندوستانی قوم کی بالادستی اور سکھ پنتھ کی بہتری کے لیے بے حد مشکلات برداشت کیں۔ اپنے تخت کی بھی قربانی دی، جلاوطنی بھی برداشت کی۔ مختصر یہ کہ ان کی شخصیت ہندوستان کی بالادستی، حب الوطنی، اور سکھ پنتھ جیسے تین خوبصورت پروں سے سجی ہوئی ہے۔ میں بھی ان کی عظمت کو سلام کرتا ہوں۔ ایسے لوگ ہی ہندوستان کے صحیح خیر خواہ تھے۔ وہ اپنے مقاصد میں کامیاب تو نہ ہوسکے، لیکن بعد میں آنے والے آزادی کے متوالوں کے لیے مشعل راہ ضرور بنے۔ انگریزوں نے انھیں تخت سے اتار کر راجا پرتاب سنگھ کو، جو ابھی بچہ تھا، راجا بنایا گیا۔ انگریزوں نے اس کی

تعلیم و تربیت کی۔ جس کے نتیجے میں وہ راجا ایک دن انگریزوں کی فوج میں شامل ہوا اور دوسری جنگ عظیم میں بطور کرنل اہم خدمات بھی سرانجام دیں۔

اس وجہ سے مجھے ریاست نابھہ بے حد پسند ہے۔ کوئی تو تھا جس نے غیر ملکی حکمرانوں کے سامنے کھڑے ہونے کا حوصلہ کیا۔ گدی سے تو ایک دن اترنا ہی تھا۔۔۔ وہ موت اتار دیتی یا انگریز!

اس نے انگریزوں کے ہاتھوں گدی سے اترنا پسند کیا۔۔۔ یہی ایک جرأت مندانہ کام سرانجام دے کر وہ امر ہو گئے۔

اندرا گاندھی اور سکھ تنازعہ

میں مدت سے اس بات کی تلاش میں تھا کہ مجھے کوئی ایسا صاحب علم مل جائے جو اندرا گاندھی اور سکھوں کے درمیان ہونے والے اختلافات کی وجہ بتا سکے اور مجھے یہ بھی بتائے کہ اندرا گاندھی نے اتنا سخت قدم، جس کی سزا کے طور پر سکھوں نے اسے قتل کر دیا، کیوں اٹھایا اور بعد میں دہلی میں ہزاروں سکھوں کا قتل عام کیا گیا اور ان کی املاک کو بھی نقصان پہنچایا گیا اس کے بعد پنجاب میں بھی ہندوؤں پر ظلم ستم ڈھائے گئے اور انھیں نقل مکانی پر بھی مجبور کیا گیا۔ سکھ آج تک اندرا گاندھی کہ اس ظلم کو معاف کرنے پر تیار نہیں ہین ان کا کہنا ہے اندرا گاندھی نے ان کے مقدس ترین مقام پر ظلم و ستم ڈھایا اس کی بے حرمتی کی اور ہزاروں سکھوں کو قتل کیا۔ ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ یہ بات بالکل غلط ہے کہ جو لوگ بھنڈرا والہ کی قیادت میں وہاں موجود تھے، وہ مسلح تھے۔ وہ سب غیر مسلح تھے اور ایک طے شدہ معاہدے پر عمل درآمد کے لیے احتجاج کر رہے تھے۔ دہلی میں اپنے دوست کے ذریعے مجھے ایک صاحب سے ملاقات کا موقع ملا۔

ان کا نام پروفیسر اکجوت سنگھ تھا۔ ان کا شعبہ بھی تاریخ سے متعلق ہی تھا اور سکے علاوہ وہ کئی کتابوں کے مصنف بھی تھے۔ ایک دن جب سب بچے دہلی کی سیر کے لیے گئے ہوئے تھے تو میں ان کے بتائے ہوئے پتہ پر پہنچ گیا۔ انھوں نے مجھے کہا کہ بہتر ہو گا کہ ہم کسی ریستوران میں بیٹھ کر بات کریں کیونکہ میری پتنی گھر پر نہیں ہے اور میں آپ کی کوئی خدمت نہیں کر سکوں گا۔ اس لیے بہتر یہ ہی ہے کہ میں آپ کو ریستوران لے چلوں تاکہ آپ کی خدمت بھی کر سکوں ورنہ مجھے بہت افسوس رہے گا۔

مجھے تو سب کچھ ہی منظور تھا، خدمت نہ بھی ہوتی صرف بات چیت بھی ہو جاتی تو بھی بہت بہتر تھا۔ میرا مقصد تو بات چیت کرنا ہی تھا لیکن کسی پنجابی سکھ کے گھر سے کچھ کھائے پئیے بغیر آ جانے کی روایت تو کہیں نہیں پائی جاتی۔

ان سے میرا پہلا سوال ان کے نام سے متعلق تھا میں نے کہا جی آپ کا نام کافی مختلف ہے میں اس کے معنی بھی جاننا چاہوں گا۔ انھوں نے بتایا کہ ہندو اور سکھ دھرم میں جو بہت بڑا فرق ہے، جس کی وجہ سے سکھ دھرم اسلام کے قریب ہے۔ وہ دنیا کے رب کو ایک مانتا ہے۔ اکجوت کا مطلب ہے، دنیا میں صرف ایک ہی خدا ہے، اسی سے روشنی ملتی ہے اور وہی اس دنیا کا مالک ہے اور وہی ہدایت دینے والا ہے۔ مجھے یہ جان کر بہت خوشی ہوئی۔

میں اپنے آنے کا مقصد پہلے ہی بتا چکا تھا اور اس کے لیے وہ ذہنی طور پر تیار بھی تھے۔ انھوں نے کہا کہ اس سے پہلے کہ میں آپ کو کچھ بتاؤں، آپ کے ذہن میں جو سوالات ہیں آپ وہ کیجیے۔ میں کوشش کروں گا کہ ان کے جوابات آپ کو دے سکوں۔

میں نے ان سے سوال کیا کہ کیا اندرا گاندھی کا سکھوں سے کوئی سیاسی اختلاف تھا؟ اس پر انھوں نے مجھے بتایا کہ آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ پہلے پنجاب اور ہریانہ ایک

ہی ہوتا تھا اور اس وقت اس صوبے میں مجموعی طور پر ہندوؤں کی تعداد ساٹھ فیصد سے زیادہ تھے جبکہ سکھ بیس فیصد سے زیادہ نہیں تھے۔ان کی بھی اکثریت موجودہ پنجاب کے علاقوں میں ہی رہتی تھی۔ اگر آج بھی آپ دیکھیں تو ہریانہ میں سکھ پانچ فیصد سے زیادہ نہیں ہیں جبکہ پنجاب میں ان کی آبادی ساٹھ فیصد سے بھی زائد ہے۔ اب بھی پنجاب میں ہندوؤں کی آبادی تیس فیصد سے زائد ہے۔

جب سکھوں نے صوبہ بناؤ تحریک چلائی تو اندرا گاندھی نے کہا کہ اگر پنجاب کو صوبہ بنایا گیا تو کانگرس پنجاب کے علاقے سے ہندو اکثریت کی حمایت کھو بیٹھے گی اور ہمارا اختیار صرف ہریانہ تک رہ جائے گا، جہاں ہندو اکثریت میں رہتے ہیں۔ اکجوت نے بتایا کہ میرا خیال ہے کہ یہ پہلا اختلاف تھا، جو اندرا گاندھی نے سکھوں کے مطالبے کے جواب میں کیا، لیکن صوبہ پھر بھی بن گیا اور وہ شاید اس بات کو بھول نہیں پائی۔

جب پنجاب کو صوبہ بنانے کی تحریک چل رہی تھی تو اس وقت وہ ایک مرکزی وزیر کے طور کام کر رہی تھیں۔ انھوں نے اپنی کتاب "مائی ٹرتھ" میں بھی اس بات کا ذکر کیا ہے۔ میں نے بھی اس کتاب کا کچھ حصہ دیکھا ہے۔ اس میں انھوں نے بڑے سخت الفاظ میں اس خدشے کا اظہار کیا ہے کہ اس سے وہ ہندو اکثریت کی حمایت کھو بیٹھیں گی اور جب پنجاب میں سکھوں کے مقابلے میں ہندو کمزور ہوں گے تو اس سے ناانصافی بھی ہو سکتی ہے۔

یاد رہے میں نے اپنے حصہ دوم میں اس بات کا ذکر کیا تھا کہ جب جنوبی ہندوستان میں زبان کی بنیاد پر نئے صوبے یعنی سٹیٹس بننا شروع ہوئے تو نہرو نے اس کی سخت مخالفت کی تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ اس سے مرکز کمزور ہوگا لیکن پھر بھی صوبے زبان کی بنیاد پر ہی بنائے گئے۔ پنجاب کا صوبہ بھی زبان کی بنیاد پر ہی بنا۔ یہ بھی اتفاق ہے کہ جغرافیائی حالات کی وجہ سے اس علاقے میں سکھوں کی اکثریت تھی، جس سے یہ

زبان کے ساتھ ساتھ ایک مذہبی مسئلہ بھی بن گیا جبکہ جنوبی ہندوستان میں مذہبی عنصر کا کوئی عمل دخل نہ تھا۔ میں نے اس بات کا تذکرہ پہلے بھی کیا ہے کہ یہ بالکل دو قومی نظریے والی بات ہی تھی جو قائدِاعظم نے ہندوؤں اور مسلمانوں سے متعلق کہی تھی۔ صوبے کی مانگ کرتے ہوئے سکھوں نے یہ بات کی تھی کہ ہندوؤں کے لیے بھارت، مسلمانوں کے لیے پاکستان اور سکھوں کے لیے پنجاب ہونا چاہیے۔

Indra Gandhi and Sikh conflict starts from Punjabi Suba Movements Photo Credit:Sky News

وہ تحریک زبان کی بنیاد پر ہی چل رہی تھی لیکن اس کے پیچھے بھی مذہبی سوچ کارفرما تھی۔ جسے اندرا گاندھی نے بھانپ لیا اور اس کے نتائج سے بھی لوگوں کو آگاہ کیا۔ اندرا گاندھی کی یہ کتاب لازمی پڑھنی چاہیے۔Indira Gandhi: My Truth

https://www.goodreads.com/book/show/290380.

Indira_Gandhi

میں نے یہ سب جاننے کے بعد اکجوت سنگھ صاحب سے کہا کہ مجھے آپ اندرا گاندھی کی سیاسی زندگی کے بارے میں بھی بتائیں۔

انھوں نے کہا کہ اندرا گاندھی جواہر لال نہرو کی بیٹی تھی اور وہ 1966ء میں حکومت میں ایک وزیر کے طور پر شامل ہوئیں۔ اس سے پہلے جواہر لال نہرو، جو بھارت کے پہلے وزیر اعظم تھے، نے بھارت کو متحد رکھنے کے لیے بھارت بھر میں رہنے والے تمام تر مذہبی، علاقائی اور مختلف تہذیبوں کے حامل لوگوں کو اکٹھا رکھنے کی کوشش کی۔ اسی سلسلے میں انھوں نے ہندی کو قومی زبان بنانے کی کوشش کی اور زبانوں کی بنیاد پر صوبے بنانے کی مخالفت کی تھی۔ اندرا گاندھی بھی انھی خیالات کی حامل تھیں۔ بنگلہ دیش کے قیام کے موقع پر وہ بھارت کی وزیر اعظم تھیں۔ بنگلہ دیش بنانے کے کارنامے کی وجہ سے بھارت میں ان کی شہرت اور عزت میں مزید اضافہ ہوا لیکن اس کے بعد 1977ء میں انھیں حکومت سے فارغ ہونا پڑا۔ جس کی وجہ ان کا بھارت میں ایمر جنسی نافذ کرنا تھی۔

یہ ان کا ایک ایسا دور ہے جس میں وہ سیاسی طور پر بہت ہیں نچلی سطح تک آ گئیں۔ پھر 1980ء میں انھیں دوبارہ وزیر اعظم بننے کا موقع ملا لیکن صرف چار سال بعد 1984ء میں انھوں نے سکھوں کے خلاف گولڈن ٹیمپل پر حملے کا حکم دے دیا جس سے ان کے خلاف بہت زیادہ نفرت نے جنم لیا۔ اس واقعے کے چند ماہ بعد ہی ایک دن ان کے دو سکھ محافظوں نے سرکاری بندوقوں سے انھیں اپنی گولیوں کا نشانہ بنا دیا۔

یہ بھی ایک دلچسپ بات ہے کہ ان کی موت سے کچھ دیر قبل حکومتی ایجنسیوں نے انھیں یہ کہا تھا کہ ان کے دونوں ذاتی محافظ سکھ ہیں اور انھیں ہٹا دینا چاہیے۔ خاص طور پر بینت سنگھ کو ہٹایا جائے لیکن اندرا گاندھی نے اس کی مخالفت کی اور کہا کہ وہ میرا وفادار ذاتی محافظ ہے اور میں اسے اپنے ساتھ ہی رکھنا چاہتی ہوں۔ اندرا گاندھی کی موت کے بعد اس کا بیٹا راجیو گاندھی بھارت کا وزیر اعظم بنا۔ اس بارے میں مزید معلومات ٹائم میں شائع ہونے والے درج ذیل مضمون سے بھی حاصل کی جا سکتی ہیں۔

https://time.com/3545867/india-1984-sikh-)

(/genocide-anniversary

میں نے اکجوت سنگھ صاحب سے پوچھا کہ جب صوبہ بن چکا تھا اور اس بات کو دیر بھی ہو چکی تھی تو پھر بھی اندراگاندھی اس واقعے کو کیوں نہیں بھول پا رہی تھیں؟ان کا کہنا تھا کہ اس موضوع پر بہت سے لوگوں نے بہت کچھ لکھا ہے۔جس میں سے اہم ترین افراد ان کی سوانح حیات لکھنے والے کیتھرائن فرانک اور ایس ایس گرل کے علاوہ بھی کئی لوگوں نے یہ بات لکھی ہے کہ دوبارہ وزیراعظم بننے کے بعد وہ ہندوؤں کے بارے میں بہت زیادہ پریشان تھیں۔

بھارتی جنتا پارٹی کا بننا اور بہت سے دیگر معاملات کی وجہ سے وہ یہ سوچ رہیں تھیں کہ اب خاص طور پر پنجاب میں سیاست کی بجائے مذہبی اور زبان کی بنیاد پر معاملات طے کیے جائیں گے جو کہ خطرناک ہو سکتے ہیں۔لوگ کسی سیاسی نظریے کی حمایت نہیں کریں گے بلکہ وہ اپنے اپنے گروہ کی مذہب اور زبان کی بنیاد پر حمایت کرنا زیادہ پسند کریں گے۔اس چیز کا احساس آر ایس ایس نے بھی کر لیا۔آپ اس بات کا اندازہ یوں لگا سکتے ہیں کہ اندراگاندھی کی موت کے بعد آر ایس ایس کے لیڈر نے یہ کہا تھا کہ اندراگاندھی نے اپنی جان کی قربانی دے کر ایک بہت بڑے مقصد کے لیے خود کو امر کر لیا ہے۔یعنی انھوں نے قومی سیاست کو بہتر رکھنے کے لیے ایک مذہبی گروپ کی سرکوبی کی ہے۔

میں نے اس موقع پر اکجوت صاحب سے پوچھا کہ کیا پنجاب کا صوبہ بننے سے سکھوں کے معاملات بہتر ہو گئے تھے؟اگر ایسا تھا تو پھر یہ دوبارہ سے مطالبات کی تحریک کس مقصد کے لیے تھیں؟

انھوں نے کہا کہ اگر میں یہ کہوں کہ جو وعدے اندراگاندھی نے سکھوں سے کیے تھے وہ سب پورے نہیں ہوئے۔مثال کے طور پر چندی گڑھ، جو کہ پنجاب میں واقع تھا،

پنجاب کو ہی دینے کا وعدہ کیا گیا لیکن اس پر عمل نہ ہوا۔ ہریانہ کے مرکزی دفاتر بھی چندی گڑھ میں ہی بنائے گئے جس کا سکھوں کو رنج تھا۔ اس کے پیچھے یہ صاف نظر آتا ہے کہ گاندھی کو پنجاب کے سکھوں کی نسبت ہریانہ کے ہندو زیادہ عزیز تھے۔ اسی طرح کا ایک واقعہ دو تحصیلوں فاضلکہ اور ابروہا کا بھی تھا جو پنجاب کا حصہ تھیں لیکن ہریانہ کو راستہ دینے کی خاطر انھیں ہریانہ سے ملایا گیا۔ مارکسی لیڈر ہرکشن سنگھ نے مارک ٹلی کو بتایا کہ اندرا گاندھی نے تین دفعہ وعدہ خلافی کی۔

اس طرح اندرا گاندھی اور سکھوں کے درمیان دوریاں بڑھتی گئیں۔ اور سکھوں کا اندرا گاندھی پر سے اعتماد بھی ختم ہوتا گیا۔ اکجوت صاحب نے کہا کہ میں آپ کو یہ بھی بتانا چاہوں گا کہ وہ دوری پیدا کرنے میں ہندوؤں کے ایک لیڈر بھجن لال کا بھی بہت بڑا ہاتھ ہے۔

اکجوت صاحب نے کچھ دیر رک کر کہا کہ مشتاق جی آپ کو یاد ہو گا کہ 1982ء میں جب دہلی میں ایشین گیمز ہو رہی تھیں تو اس وقت اکالی دل کے لوگوں نے کہا کہ ہم وہ گیمز نہیں ہونے دیں گے۔ اس موقع پر کسی بھی سکھ کو پنجاب سے دہلی کی طرف نہیں جانے دیا گیا۔ جو بھی کوشش کرتا اسے گرفتار کر لیا جاتا اور اس کی کافی مرمت بھی کی جاتی اور ذلیل بھی کیا جاتا۔ یہیں پر بس نہیں ہوئی بلکہ 1983ء کے آغاز میں ہریانہ کے کچھ علاقوں میں سکھوں کے خلاف ہنگامے ہوئے جس میں سکھوں کو مارا بھی گیا۔ اس کے بدلے میں پنجاب میں سکھوں نے ہندوؤں کو مارنا شروع کر دیا۔ اس وقت سکھ ہندو فسادات کی آگ دور تک پھیل گئی تھی۔ سکھوں کا یہ خیال تھا کہ یہ سب کچھ اندرا گاندھی کی ایماء پر ہو رہا ہے۔

ان تمام واقعات کو درج ذیل کتاب میں تفصیل سے لکھا گیا ہے۔

Amritsar : Mrs Gandhi's last battle / Mark Tully & Satish ...Jacob

میں نے بھی اس کتاب کا کچھ حصہ پڑھا ہے جس میں بہت تفصیل سے اس واقعے کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ کتاب scribd.com سے مل سکتی ہے۔

اس کتاب میں یہ واضح طور پر لکھا ہوا ہے کہ کس طرح پانی پت میں سکھوں کو بسوں سے نکال کر قتل کیا گیا اور ان کی تذلیل کی گئی۔ یہ سب کہہ کر اکجوت صاحب نے کہا کہ مشتاق جی ان حالات میں سکھوں اور ہندوؤں کے درمیان لڑائی سیاسی یا زبان کی بنیاد پر نہیں بلکہ مذہب کی بنیاد پر ہونا شروع ہو گئی تھی۔ ایک طرف بہت نازک صورت حال تھی اور دوسری طرف حالات ایسے تھے کہ اندرا گاندھی کو کوئی فیصلہ تو کرنا ہی تھا۔

میں نے ان سے کہا کہ کچھ لوگوں کا یہ خیال بھی ہے کہ وہ فیصلہ اندرا نے نہیں کیا یا کم از کم وہ اس فیصلے کے حق میں نہیں تھیں۔ فیصلہ ان سے فوج نے کروایا گیا تھا۔ کچھ لوگوں کا یہ بھی کہنا ہے کہ اس آپریشن کی بنیاد پنجاب میں ہندوؤں پر ہونے والے مظالم ہیں۔ اس پر آپ کیا کہتے ہیں؟

اکجوت صاحب نے کہا کہ یہ بات ماننا مشکل ہے۔ میرے نزدیک وہ آپریشن درحقیقت چند انتہا پسندوں کی وجہ سے ہوا۔ اندرا گاندھی کو کم از کم اتنا ضرور پتہ تھا کہ سکھوں کے مذہب میں گولڈن ٹیمپل کا کیا مقام ہے اور ایسا کرنے سے کتنے خطرناک نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔ اس لیے لوگ کہتے ہیں کہ اندرا گاندھی کا سکھوں سے اختلاف ضرور تھا اور وہ اس حد تک جانے کو تیار نہ تھیں لیکن اکالی دل کے لوگ یہ بات ماننے کو تیار نہیں ہیں۔ دونوں طرف کے لوگوں کا مؤقف سامنے آ رہا ہے۔ اندر کیا بات ہوئی، یہ کہنا کافی مشکل ہے لیکن جو واقعہ ہوا وہ ایسا واقعہ تھا جو بھارت کی تاریخ میں بہت ہی کم سامنے آیا اور اس کے نتائج بھی بہت سخت نکلے۔

اب بھی جب ہندوؤں اور سکھوں کے درمیان کوئی بات چیت ہوتی ہے تو درمیان میں گولڈن ٹیمپل کی جلی ہوئی عمارتیں بھنڈراں والا اور ان کے ساتھیوں کی لاشیں انھیں آپس میں ملنے نہیں دیتیں۔ سکھوں کا کہنا ہے وہ کام ہندوؤں کا تھا جنھوں نے مذہب کی بنیاد پر ہم پر حملہ کیا تھا۔

میں نے چند دن پہلے کچھ ایسی ویڈیوز دیکھیں جس میں ایک صاحب حملے کے وقت گولڈن ٹیمپل کے حملہ سے متعلق حالات وواقعات بیان کر رہے تھے۔ وہ بھنڈراوالا کے ساتھی تھے اور حملہ کے وقت ان کے ساتھ تھے۔ انھوں نے کہا کہ حملے کے وقت مقامی پولیس کو ہٹا دیا گیا تھا۔ صرف فوج کے لوگ تھے اور ان میں بھی کوئی سکھ نہیں تھا۔ سب ہی ہندو تھے۔ انھوں نے ظلم کی انتہا کر دی تھی۔ بچوں کو ہوا میں اچھال کر گولی مارتے تھے۔ اس طرح کی بے شمار ویڈیوز موجود ہیں جن میں گولڈن ٹیمپل کے واقعات پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔

اس سلسلے میں لکھی جانے والی ایک اہم کتاب "آپریشن ان پنجاب"

(Opression in Punjab) ہند مزدور کسان پنچائیت پبلیکیشن نے 1985ء میں شائع کی۔ اس کتاب میں آپریشن بلیو سٹار کی تمام تر تفصیلات بیان کی گئی ہیں۔ اسے پانچ مختلف لوگوں نے ملکر لکھا ہے۔ ایک طرح سے یہ آپریشن بلیو سٹار کی ایک رپورٹ ہے۔ اس کا پیش لفظ جسٹس وی ایم ترکنڈی نے لکھا ہے۔

اس کا تعارف جارج فرنینڈس سے لکھا ہے۔ میں نے اب تک آپریشن بلیو سٹار پر جتنی بھی کتابیں پڑھی ہیں، میرے نزدیک معلومات کے لحاظ سے یہ کتاب ان مین سب سے بہتر ہے۔ اس کی دو وجوہات ہیں۔ ایک تو یہ کہ یہ کتاب اس واقعے کے ایک سال بعد ہی لکھی گئی اور دوسرا یہ کہ اسے ایک بڑے ادارے نے شائع کیا ہے اور اسے پانچ لوگوں

نے مل کر لکھا ہے۔ اس کے مصنفین کے نام پڑھ کر مجھے نہیں لگتا کہ ان میں کوئی سکھ بھی ہے۔ اس کتاب میں بھی یہی کہا گیا ہے کہ گولڈن ٹیمپل پر حملہ سکھوں کی طاقت کو ختم کرنے کے لیے کیا گیا تھا۔

میں نے اب تک آپریشن بلیو سٹار سے متعلق جو بھی پڑھا ہے اس کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ سکھوں کے ایک گروہ کا یہ مطالبہ کہ ان کے صوبے کو اندرونی آزادی دی جائے اور وہ بھارت کا حصہ بھی رہے، اپنے معاملات میں خود مختار ہو، یعنی فوج، دفاع، کرنسی اور غیر ملکی تعلقات وغیرہ بھارت کے پاس ہوں، اندرونی معاملات میں آزاد ہو۔ بھارت کی مرکزی حکومت کے مطابق ایک طرح سے علیحدگی کی بات تھی، جو کسی صورت میں بھی نہیں مانی جا سکتی تھی۔

بھنڈراں والا اور اس کے ساتھی اس بات کے حامی تھے۔ لیکن یہ کہنا کہ تمام سکھ اس بات کے حامی تھے، مناسب نہ ہوگا۔ دوسری طرف اندرا گاندھی کو اس بات کا احساس ہو رہا تھا کے صوبہ پنجاب بنانے سے سکھوں کی اکثریت کو ایک صوبہ مل گیا ہے جس کی بنیاد پر وہ بھارت کے لیے دفاعی مسائل پیدا کر سکتے ہیں۔

میری اس بات سے شاید بہت سے لوگ اتفاق نہ کرتے ہوں لیکن میرا خیال ہے اور میں بہت حد تک اپنی اس بات پر یقین بھی رکھتا ہوں کہ پنجاب کے مرکز میں سکھوں کی حکومت پاکستان کے مفاد میں تو تھی لیکن بھارت کے مفاد میں نہیں تھی۔ ایسا ہونے سے بھارتی دفاع کو نقصان پہنچ سکتا تھا۔ اس وجہ سے اندرا گاندھی نہیں چاہتی تھیں کہ پاکستان اور بھارت کی سرحد پر ایک ایسا صوبہ موجود ہو جس کے پاکستانی پنجاب یا پاکستان کے ساتھ اچھے تعلقات ہوں۔ ایسا ہونا بھارت کے مفاد میں نہیں تھا۔ اگر آپ کو یاد ہو تو ایک دفعہ گریٹر پنجاب کی بات بھی چل رہی تھی۔ میرے خیال میں یہی وہ عنصر تھا جس نے بھارتی فوج کو اس بات پر مجبور کیا کہ وہ پنجاب سے سکھوں کی طاقت کو ختم

کرے اور اس کے لیے انھوں نے اندرا گاندھی کو قائل بھی کیا اور اس وقت کے صدر، جو بھارت کے پہلے سکھ صدر ہیں، گیانی زیل سنگھ سے اس بات کی منظوری بھی لی۔

Proposed Khalistan by Sikhs Photo Credit:
https://iowalum.com/khalistan/

بھارت اب تک اس بات کا برملا اظہار کرتا ہے کہ پاکستان خالصتان تحریک کی پشت پناہی کر رہا ہے لیکن پاکستان نے ہمیشہ اس بات کی تردید کی ہے۔ میں نے پوچھا کہ آپ کیا سمجھتے ہیں؟

انھوں نے کہ یہ بات کہاں تک درست ہے؟ معلوم نہیں، لیکن میرا خیال ہے کہ یہ ایک مذہبی مسئلہ نہیں تھا اور نہ ہی یہ زبان کی بنیاد پر ایک صوبے کی تشکیل کا مسئلہ تھا۔ تقسیم ہند کے وقت سکھوں نے ہندوؤں کا ساتھ دیا، لیکن ماسٹر تارا سنگھ نے جلد ہی بھارت کی مرکزی قیادت کے خلاف کام شروع کر دیا تھا۔ اس نے ایک طویل بھوک ہڑتال بھی کی۔ اس طرح ساٹھ کی دہائی سے ہی سکھوں اور ہندوؤں کے درمیان اختلافات شروع ہو گئے۔ جس کا فائدہ پاکستان کو ہی پہنچتا تھا۔ یہ بات بھارت کو ہرگز قبول نہ تھی۔ اس لیے وہ ہر حال میں پنجاب سے ایسے سکھ گروہوں کا خاتمہ چاہتے تھے جو پاکستان کی طرف جھکاؤ رکھتا ہو۔ اس کی ایک اور وجہ یہ بھی تھی کہ بھارت سمجھتا تھا کہ جو کچھ اس

نے بنگلہ دیش بنانے میں کیا ہے پاکستان اس کا بدلہ خالصتان بنا کر لینا چاہتا ہے۔ پاکستان نے دنیا کے ہر فورم پر اس بات کی نفی کی لیکن بھارت اپنی بات پر مسلسل اصرار کرتا رہا اور اب بھی کر رہا ہے۔

اب ہمیں باتیں کرتے کافی وقت ہو چکا تھا۔ میں اٹھنے سے پہلے اکجوت صاحب سے پوچھنا چاہتا تھا کہ کیا خالصتان کی تحریک ختم ہو گئی ہے؟ یہ ایک سادہ سا سوال تھا لیکن ان کا جواب کافی مختلف تھا۔ انھوں نے کہا کہ مشتاق جی، اصل جنگ بھارت اور پاکستان کی ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ دوستی نہیں چاہتے۔ عوام تو پہلے بھی چاہتے تھے اب بھی چاہتے ہیں لیکن ہماری افواج اور مقتدر ادارے ایسا نہیں چاہتے۔ یہ چپقلش اس خطے کے آدھے سے زیادہ لوگوں کو غربت کی لیکر سے نیچے زندہ رہنے پر مجبور کر رہی ہے۔ جنگ ختم ہو تو کوئی ان لوگوں کو غربت اور جہالت سے باہر نکالنے کی کوشش کرے۔ ایسا ہو نہیں رہا اور مجھے نہیں لگتا کہ کبھی ایسا ہو بھی پائے گا۔ ہم اس امید پر ہی قائم ہیں کہ شاید کبھی تو کوئی اپنی ذات سے آگے سوچے۔ خالصتان تحریک ہو، کشمیر، آسام، ناگالینڈ، منی ہور، میزورام ہو یا پاکستان میں آزاد بلوچستان، سندھو دیش ہو یا پھر پختونستان کا معاملہ، یہ اسی بڑی جنگ کا حصہ ہیں جو پاکستان اور بھارت کے درمیان پچھلے پچاس سال سے جاری ہے۔ کب تک جاری رہتی ہے، معلوم نہیں۔۔۔

Photo Credit:BBC

یہ سب بول کر انھوں نے کہا کہ میں نے آپ کو یہ نہیں بتایا کہ میری پیدائش چکوال کی ہے۔۔۔ اگر کبھی وہاں جانا ہو تو وہاں قائم خالصہ سکول میں جا کر اس کی در و دیوار کو میرا اسلام کہہ دینا۔ میں جانا بھی چاہتا ہوں لیکن میرے اندر اس چھوٹے دیار کو دیکھنے کا حوصلہ نہیں ہے۔۔۔

میرے یار یا تو میری طرح بوڑھے ہو گئے ہوں گے یا پھر اگلے جہاں چلے گئے ہوں گے۔ میں جب بھی اداس ہوتا ہوں تو چکوال چلا جاتا ہوں۔۔۔ مجھے وہاں جانے کی لیے کسی ویزہ کی ضرورت نہیں ہوتی۔ آنکھیں بند کی اور اپنی گلی دیکھ لی۔۔۔

"دل کے آئینے میں ہے تصویر یار

جب ذرا گردن جھکائی دیکھ لی"

پھر انھوں نے اپنی جیب سے رومال نکالا اور اسے کچھ دیر گیلا ہونے دیا اور پھر محبت اور یاد کے آنسو اپنی جیب میں رکھ لیے۔۔۔

اور منہ دوسری طرف کرکے چل دیے۔۔۔

یہ بھی نہ دیکھا کہ میں بھی جیب سے رومال نکال رہا ہوں۔۔۔

کچھ دور جا کر وہ رکے۔۔۔

کہا مشتاق جی۔۔۔ تاریخ یہ بتائے گی کہ یہ آزادی ہند نہیں تھی، بلکہ یہ تقسیم ہند تھی، تقسیم معاشرہ تھی، تقسیم تہذیب اور تقسیم تمدن تھی جو کئی ہزار سال پرانی تھی۔۔۔

میں تو یہ سوچتا ہوں کہ ہندوستانی معاشرے میں اتنا ظرف تھا کہ اس نے مشرق سے آنے والے بدھ کو بھی قبول کیا، وسطی ایشیاء سے والے مغل کو بھی، افغانستان سے

آنے والے پختون کو بھی، یورپ سے آنے والے انگریز کو بھی، فرانسیسی اور ڈچ کو بھی، عرب سے آنے والے عرب کو بھی، افریقہ سے آنے والے افریقی کو بھی۔۔۔

سب کو اپنی دھرتی بھی دی اپنا دل بھی دیا اور پھر اسے ایک دن مذہب کی بنیاد پر دو حصوں میں بانٹ دیا۔۔۔ ایسا نہ ہوتا تو بہتر تھا۔۔۔ لیکن آپ کو یہ بھی بھولنا نہیں چاہیے کہ ہندوستان کے لوگوں نے یہ صرف ایک قوم کے خلاف تحریک چلائی اور انھیں کہا کہ ہندوستان چھوڑ دو۔۔

اور وہ صرف انگریز تھے۔ جو یہاں رہنے کے لیے نہیں بلکہ لوٹنے کے لیے آئے تھے۔ انھوں نے ہمیں دوست کی بجائے غلام بنانا چاہا اور وہ ہمیں کبھی بھی منظور نہیں تھا۔ ہندوستان میں تو صدیوں تک غلامی کا تصور نہیں تھا۔ جب امریکہ، عرب اور افریقہ میں غلاموں کی منڈیاں لگتی تھیں اس وقت بھی ہندوستان میں کہیں ایسا نہیں ہوتا تھا۔

اہل ہندوستان کا دل بہت بڑا تھا لیکن دوستوں کے لیے۔۔۔ کوئی تو تھا جس نے اس کے دل میں تنگی پیدا کی، اس میں اس کا مفاد ہو گا، کچھ مفاد پرست، جھوٹی انا کے مارے لوگ، ذاتی مفاد کے حامی اور پرستار ان کے ساتھی بن گئے۔

پھر تقسیم ہند، تقسیم پنجاب، تقسیم بنگال، تقسیم سندھ، تقسیم تھرپارکر، بنگلہ دیش، سندھو دیش، خالصتان، میزورام، ناگا لینڈ، پاکستان اور بھارت کی جنگیں، غریب ملک، ہمیشہ کے لیے مغرب کے معاشی غلام، ہر وقت حالت جنگ، میل ملاپ پر پابندی، اس کے علاوہ بھی بہت کچھ، کچھ بھی قابلِ فخر نہیں۔

یہ سب نتیجہ ہے انگریز کی پالیسی کا ہے جس نے اس بات کا برا منایا کہ اسے یہاں سے کیوں نکالا؟ درحقیت انگریز گیا نہیں ہے، بلکہ اس نے اپنی رسی لمبی کر لی، ہماری گردن ابھی اس کی رسی میں ہے، فرق صرف یہ ہوا کہ پہلے بندوق کی طاقت کا سہارا تھا اب ڈالر کی طاقت کا استعمال ہے۔۔۔

ہم جسمانی طور پر آزاد تو ضرور ہوئے لیکن جب تک معاشی آزادی نہیں ملتی، ہم غلام ہی رہیں گے !

انھی سوچوں کے ساتھ میں نے اپنے میزبان کا شکریہ ادا کیا

Distribution Of Muslim Population In 1941

53.21 %

Above 90%
80% - 90%
70% - 80%
60% - 70%
50% - 60%
40% - 50%
30% - 40%
20% - 30%
10% - 20%
00% - 10%

Tariq Amir
tariqamir1015@gmail.com
05.10.2014.

Photo Credit: https://www.reddit.com

Religion Wise
Population of Punjab
www.punjabdata.com

Sikh (57.69%)
Hindu (38.49%)
Muslim (1.93%)
Christian (1.25%)
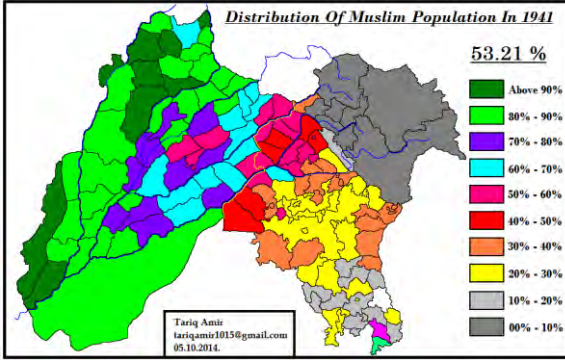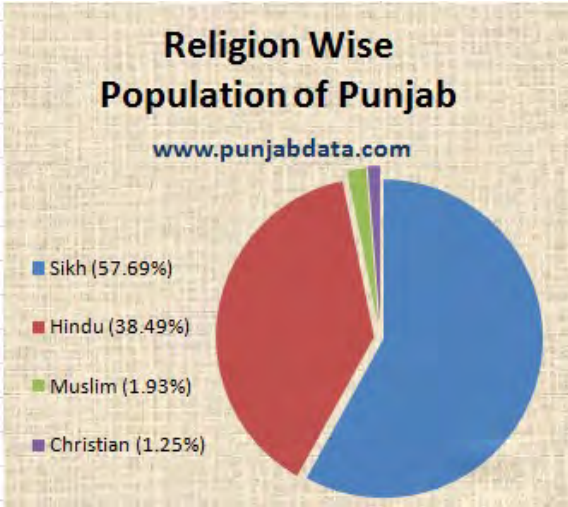
Religion Wise Population of Indian Punjab in 2011

Photo Credit: https://www.punjabdata.com

تقسیم ہند، تقسیم پنجاب، ماسٹر تارا سنگھ ہندوؤں کا دوست بھی اور دشمن بھی

آج کا دن سب لوگوں نے آرام اور چھوٹی موٹی شاپنگ کے لیے رکھا ہوا تھا۔ بچے مختلف ٹولیوں میں مختلف مارکیٹس میں چلے گئے۔ میں نے جو کچھ بھی اپنے گھر والوں کے لیے لینا تھا وہ میں پہلے ہی لے چکا تھا لیکن میرا ایک ایسا سوال تھا جو ابھی تک تشنہ تھا جس کے لیے مجھے کوئی ایسے صاحب نہیں مل پا رہے تھے جو میرے اس سوال کا جواب دے سکیں۔

پچھلے کئی دنوں سے ہم ہوٹل میں رہ رہے تھے اور اس ہوٹل کے مینجر صاحب ، جن کا نام آدیش تھا، سے میری اچھی دوستی ہو گئی تھی۔ میں نے انھیں اپنا مسئلہ بتایا اور کہا کہ مجھے کسی ایسے صاحب سے ملنے کا شوق ہے جو یہ بتا سکیں کہ تقسیم ہند کے وقت سکھوں نے ہندوؤں کے ساتھ مل کر پنجاب کی تقسیم کا فیصلہ کیا اور پھر پنجاب کے دو حصے ہو گئے ایک حصے میں ہندوؤں اور سکھوں کی اکثریت ہو گئی اور دوسرے میں مسلمان اکثریت میں تھے۔ اکثریت کو مزید بہتر کرنے کے لیے مشرقی پنجاب اور مغربی پنجاب میں بڑے پیمانے پر نقل مکانی ہوئی۔ جو ایک بڑی تباہی کی داستان ہے۔ میں یہ جاننا چاہ رہا ہوں کہ اس موقع پر سکھوں نے ہندوؤں کا ساتھ کیوں دیا جبکہ ان کی بہت بڑی تعداد مغربی پنجاب میں رہتی تھی۔ مغربی پنجاب میں ان کے مقدس ترین مقامات بھی موجود تھے۔ میں نے اس بات کا ذکر آدیش صاحب سے کیا تو انھوں نے کہا کہ میں کوشش کرتا ہوں کہ اس بات کا علم رکھنے والے کوئی صاحب مل جائیں۔

کچھ دیر بعد انھوں نے مجھے کہا کہ ایک صاحب جو میرے دوست کے انکل ہیں، ویسے تو وہ کوئی کاروبار کرتے ہیں لیکن انھیں سیاسی معاملات کی کافی سمجھ بوجھ ہے تو ان سے آپ کی ملاقات ہو سکتی ہے۔ چار بجے کے بعد جب وہ اپنے کام سے واپس آئیں گے

تو میں ان سے بات کروں گا۔ ان کا گھر قریب ہی ہے۔ امید ہے کہ آپ کی ان سے ملاقات ہو جائے گی۔ میں شام چار بجے کے انتظار میں بیٹھ گیا۔ چار بجے کے قریب ان سے رابطہ ہوا تو انھوں نے کہا کہ آپ میرے گھر ہی آ جائیں اور ان کے گھر چلا گیا۔ ان کا گھر ایک فلیٹ میں تھا جو دوسری منزل پر تھا۔ اس گھر میں وہ اور ان کی بیوی ہی تھے۔ ان کی بیوی کی بھی کسی پاکستانی سے پہلی ملاقات تھی۔ اس لیے وہ بھی شوق سے ہمارے پاس بیٹھ گئیں اور ہماری باتیں سننے لگیں۔ کبھی کبھی اپنی طرف سے بھی کوئی بات کہہ دیتیں۔

ان صاحب کا نام بجھن لال تھا۔ ان کی عمر تقریباً ساٹھ سال کے قریب ہو گی۔ مجھے اب تک ان کے گھر کا نقشہ یاد ہے۔ وہ ایک کونے والا فلیٹ تھا۔ بچوں کے بارے میں پوچھا تو کہنے لگے کہ وہ اب بڑے ہو گئے ہیں اور کسی دوسرے شہر میں رہتے ہیں۔ گھر میں میاں بیوی ہی رہتے ہیں۔ اس سے زیادہ تفصیل میں ان سے نہیں پوچھ پایا۔ میں نے محسوس کیا کہ بچوں کا گھروں سے چلے جانا اب ایک عام سی بات ہو گئی ہے لیکن والدین، جو ایک مدت سے بچوں کے ساتھ رہ رہے ہوتے ہیں ان پر کیا بیتتی ہے وہ بجھن لال اور ان کی بیوی کے چہرے سے عیاں تھی۔

یہ سب موجودہ ترقی یافتہ اور صنعتی دور کے ناپسندیدہ تحفے ہیں جو ہر حال میں قبول کرنے پڑتے ہیں۔ ایسا ہی اس گھر میں بھی ہوا!

حال احوال کے بعد میں نے کہا میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تقسیم ہند کے وقت یہ طے ہوا تھا کہ ہر صوبے کی اسمبلی اپنے مستقبل کا فیصلہ کرے گی۔ صوبہ پنجاب اور بنگال کی اسمبلی کے علاوہ باقی تمام اسمبلیاں اس فیصلے سے متفق تھیں۔ صوبہ سرحد میں اسمبلی سے پوچھنے کی بجائے لوگوں سے پوچھا گیا۔ اس موقع پر پنجاب اسمبلی دو حصوں میں تقسیم ہو گئی، ایک نے پاکستان کے ساتھ اور دوسرے نے بھارت کے ساتھ رہنے کا فیصلہ کیا۔

اس دوران سکھوں نے ہندوؤں کا ساتھ دیا، جس پر پنجاب تقسیم ہوا لیکن اس کے چند سال بعد ہی ماسٹر تارا سنگھ، جو سکھوں کے راہ نما تھے، نے بھارتی حکومت کے خلاف احتجاج شروع کر دیا اور ایک طویل بھوک ہڑتال بھی کی۔ پھر سکھوں نے صوبہ بناؤ تحریک چلائی۔ ایک وقت آیا جب سکھوں نے کوشش کرکے اپنا صوبہ بھی الگ بنوایا۔ بعد ازاں گولڈن ٹیمپل کا وقعہ ہوا اور خالصتان کی تحریک بھی چلی۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کی ماسٹر تارا سنگھ کا وہ فیصلہ کہ وہ ہندوستان کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں، کی بنیاد کیا تھی؟۔ کیا بعد میں وہ اس فیصلے پر خوش تھے یا پچھتا رہے تھے؟ سکھ اس بارے میں کیا سوچتے ہیں میں اس بارے میں آپ کا تجزیہ جاننا چاہتا ہوں۔

بجھن لال صاحب نے جواب دینے سے پہلے کہا کہ مشتاق جی آپ کو کچھ باتیں اس سے پہلے کی بھی جاننا ہونگی۔

میں اس بارے میں کچھ زیادہ نہیں کہنا چاہتا کہ ہندوؤں کا سکھوں کے بارے میں کیا خیال ہے لیکن یہ بات یاد رکھیں کہ سکھوں کے گرو بابا نانک ایک ہندو خاندان سے ہی تعلق رکھتے تھے۔ ایک مدت تک ہندو، سکھوں کو اپنا ہی ایک فرقہ مانتے تھے۔ میرے خیال میں پہلے سو سال تک کچھ ایسا ہی معاملہ رہا۔ان کی آپس میں رشتہ داریاں بھی ہوتی تھیں۔آپس میں اچھے تعلقات بھی تھے۔جب سکھوں کی طاقت میں اضافہ ہونا شروع ہوا اور ان کے گردوارے بننے شروع ہوئے تو پھر ہندوؤں کو بھی احساس ہوا کہ اب یہ ایک بڑا گروہ ہے لہٰذا انھوں نے انھیں اہمیت بھی دینا شروع کر دی۔ اتفاق یہ ہوا کہ پنجاب کے کچھ علاقوں میں جاٹ ایک بڑی تعداد میں سکھ مذہب قبول کرنے لگ گئے ۔ جس کی وجہ سے کئی علاقوں میں ہندو اقلیت میں چلے گئے۔ یہی وہ وقت تھا جب ہندوؤں کو احساس ہونا شروع ہوا کہ پنجاب کے کچھ اضلاع میں وہ اقلیت میں جا سکتے ہیں۔ اس دوران سکھوں کے گردوارے بننا شروع ہو گئے اور جب انگریزوں کے سامنے

کوئی کھڑا نہیں ہو رہا تھا تب انھوں نے انگریزوں کے ساتھ جنگیں بھی کیں۔انھوں نے رنجیت سنگھ کی قیادت میں اپنے وقت کی ایک بہت بڑی ریاست بھی قائم کی۔اس دوران سکھوں کی مسلمانوں سے عداوت بھی شروع ہو گئی، لیکن ہمیں کوئی ایسا واقعہ نہیں ملتا جہاں وہ ہندوؤں کے مد مقابل نہ کھڑے ہوں۔

یہ سب جان کر میں نے بھجن صاحب سے کہا کہ میں نے کئی کتابوں میں پڑھا ہے کہ سکھوں نے گردوراہ ریفارم کمیٹی بھی بنائی اور اس کے لیے کوششیں بھی کیں۔ انھوں نے شری گردوارہ پرابندھک کمیٹی بھی بنائی۔ اسکی کیا ضرورت پیش آئی تھی؟ میں نے ان سے یہ بھی پوچھا کہ گردوارہ ایکٹ کیا تھا؟ میری بات کے جواب میں انھوں نے کہا کہ انگریزوں کی فتح کے بعد گردوارے مقامی افسران کے کنٹرول میں تھے۔ انگریز کی انتظامیہ بھی ان کی دیکھ بھال کرتی تھی۔ 1920ء میں سکھوں نے اپنے گردواروں کی حفاظت کے لیے سوچنا شروع کیا اور یہ طے کیا کہ وہ اپنے گردواروں کی حفاظت خود کریں گے۔ اس کام کے لیے شری گردوارہ پرابندھک کمیٹی بنائی۔ اسی دور میں اکالی دل کا آغاز بھی ہوا۔

Master Tara Singh
Photo Credit: Govt of Punjab through twitter.com

اس کمیٹی کو قائم کرتے وقت سکھوں نے پہلی مرتبہ متحد ہو کر انگریزوں کے سامنے ایک بڑے پیمانے پر احتجاج شروع کیا۔ یہ وہی دور تھا جب خلافت کی تحریک بھی چل رہی تھی۔ اس وقت سکھوں نے اکالی دل کے نام سے ایک جماعت بھی بنائی۔ میں نے پوچھا کہ اکالی کا کیا مطلب ہوتا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ اکالی کا لفظ اکل سے نکلا ہے جس کا مطلب ہے سدا رہنے والے، ہمیشہ چمکنے والا، اور دل کا مطلب ایک گروہ ہوتا ہے۔ اسی طرح پنتھ بھی سکھ دھرم کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

اب سکھ ایک سیاسی قوت بھی بن رہے تھے۔ جو نہ ہی انگریزوں کو پسند تھا اور نہ ہی ہندوؤں کو۔ پسند ہو یہ نہ ہو، لیکن یہ حقیت تھی کہ سکھ ایک طاقت کا نام تھے، کئی سکھ ریاستیں ان کی پشت پر تھیں، لوگوں کی بڑی تعداد سکھ مذہب سے تعلق رکھتی تھی۔ اس بات کا احساس سکھوں کو بھی تھا۔ میں اس کی مزید تفصیل میں نہیں جانا چاہتا لیکن یہ سب بتانے کا مقصد ہے کہ اب سیاسی میدان میں سکھوں کو نظر انداز کرنا ممکن نہ تھا۔

نومبر 1920ء میں لاہور میں سکھوں کا ایک بڑا اکٹھ ہوا۔ جس میں شری گردوارہ پرابندھک کمیٹی بنائی گئی۔ اس سے پہلے انگریز بھی ایک کمیٹی بنا چکے تھے، ان کے ممبرز کو بھی اس میں شامل کیا گیا۔ یہ کمیٹی پونے دو سو افراد پر مشتمل تھی۔ ماسٹر تارا سنگھ بھی اس کے ممبر تھے۔ اس کام کے لیے بے شمار جتھے بنے، جنھوں نے گردواروں کا کنٹرول سنبھال لیا۔ اس کمیٹی نے گردواروں پر پہلے سے قابض مختلف لوگوں کے قبضے سے گردوارے بھی چھڑوائے۔ اس جدوجہد کے نتیجے میں گردوارہ ایکٹ 1925ء لاگو کیا گیا۔ اس ایکٹ کے تحت انگریزوں نے شری گردوارہ پرابندھک کمیٹی کو ماننے سے انکار کر دیا۔ یہ ایک طویل داستان ہے کہ کس طرح سکھوں کے مختلف گروہوں نے اس کام کے لیے کوشش کی۔ ان کی تفصیل میں جانا آپ کے سوال کے لیے زیادہ فائدہ مند ثابت نہیں ہوگا۔

یہ سب میں آپکو صرف اس لیے بتانا چاہتا تھا کہ کس طرح سکھوں کو اپنی الگ سیاسی شناخت کا خیال آیا اور کس طرح باقی لوگوں نے اسے لیا۔ اس سب کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوؤں کو احساس ہو گیا کہ سکھ ایک بڑی قوت بن چکے ہیں۔ یہ بات ہندوؤں کو قبول نہیں تھی، لیکن اب تحریک آزادی ہند میں، خاص طور پر پنجاب میں سکھوں کو ساتھ لے کر چلنا ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کی مجبوری بن چکا تھا۔

سکھوں کو بھی اس بات کا ادراک تھا اور اب سکھوں کو فیصلہ کرنا تھا کہ وہ کس کا ساتھ دیں؛ ہندوؤں کا یا مسلمانوں کا۔ اس بارے محمد ادریس نے ایک مضمون لکھا ہے جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ اس دور میں اکالی دل کے علاوہ بھی کچھ سکھوں نے Panthic partyکے نام سے ایک الگ پارٹی بنائی۔

میں نے بجھن صاحب سے سینٹرل سکھ لیگ سے متعلق بھی پوچھا۔ میں نے پوچھا کہ اکالی دل کے ساتھ ساتھ سکھوں کو ایک اور سیاسی جماعت بنانے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟۔ اس پر انھوں نے ایک ایسی بات کہی جس کا میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

انھوں نے بتایا کہ سینٹرل سکھ لیگ ایک سیاسی جماعت تھی۔ اس کی بنیاد 19 دسمبر 1919ء کو امرتسر میں رکھی گئی۔ اس کے پہلے صدر سردار بہاد گجن سنگھ چنے گئے ۔ اس پارٹی کے بنیادی طور پر دو مقاصد تھے، ایک ہندوستان کی آزادی اور دوسرا سکھ دھرم کا فروغ۔ اس پارٹی نے کئی ایسے کام بھی شروع کیے جو سکھوں کے لیے بے حد مفید تھے۔ مثال کے طور پر پنجاب قانون ساز کونسل میں سکھوں کی نمائندگی، کرپان لے جانے پر پابندی کو ختم کرنا وغیرہ۔ اس پارٹی کا رجحان مہاتما گاندھی کی طرف تھا۔
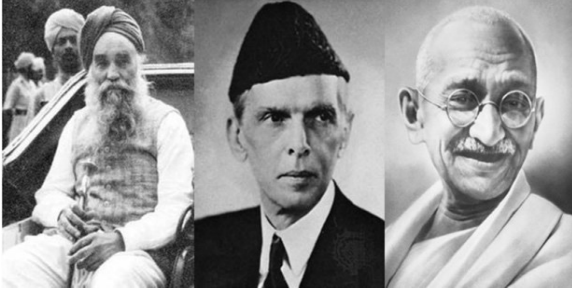
Mahtma Gandhi, Quaid-e-azam and master Tara Singh
Photo Credit: https://discover.hubpages.com

میں نے یہ سن کر کہا کہ یہ پارٹی تو ایک طرح سے مذہبی پارٹی تھی۔ جب کہ اسکے مقابلہ میں مسلم لیگ اور کانگرس مذہبی بالادستی کے لیے کام نہیں کر رہی تھیں۔ بجھن لال صاحب نے کہا کہ ان کے خیال میں یہ بات بہت حد تک واضح تھی کہ کانگرس ہندوؤں کی جماعت ہے اور مسلم لیگ مسلمانوں کی اور اس لیے سکھوں کی ایک الگ جماعت کا ہونا بھی ضروری تھا۔ یہی وہ دور تھا جب سکھوں نے اپنے آپ کو ہندوؤں اور مسلمانوں سے الگ کرنا شروع کر دیا۔ خالصہ سکول اور کالجز بنائے گئے۔ انھیں کسی کے ساتھ مل کر تو چلنا ہی تھا اور اس کے لیے ان کا انتخاب کانگرس تھا، مسلم لیگ نہیں۔ میں نے ان سے اس کی وجہ تو نہ پوچھی البتہ اپنے طور پر جو کچھ جانا وہ پیش خدمت ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ سکھ قدرتی طور پر مسلمانوں کی نسبت ہندوؤں کے زیادہ قریب ہیں۔ ہندو سکھ فسادات کا ذکر کہیں نہیں ملتا البتہ، ہندو مسلم اور سکھ مسلم فسادات کا ذکر اکثر ملتا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ دونوں کے مذہبی معاملات کی آپس میں کافی زیادہ مماثلت ہونا ہے۔ اس موضوع پر ڈاکٹر امبید کر نے بھی اپنی کتاب Pakistan or The Partition of India میں تفصیل سے لکھا ہے۔ یہ کتاب 1940ء میں لکھی گئی۔

میرے نزدیک اس کی دوسری وجہ ایک طویل عرصے تک سکھوں کی مسلمانوں کے ساتھ جنگیں ہیں۔ خاص طور پر مغل حکمرانوں کے ساتھ ان کے معاملات بے حد کشیدہ رہے۔ ان کے دو اہم گوروؤں کا مغل حکمرانوں کے ہاتھوں قتل، گردواروں کی بے حرمتی، سکھوں کے سر کی قیمت رکھنا اور اس طرح کے کئی دوسرے معاملات ان کے اور مسلمانوں کے درمیان دوری کا سبب بنے۔ اس بارے میں مزید معلومات جی ایس ڈھلوں کی کتاب سے بھی مل سکتی ہیں۔ انگریزوں کے آنے سے پہلے تک وہ ایک طرح سے مسلمانوں کے ماتحت تھے۔ اب وہ مسلمانوں کی حکمرانی مزید نہیں چاہتے تھے۔ کیونکہ ایسا کرنا پھر سے اقلیت میں چلے جانے کے مترادف تھا۔

اگر وہ ہندوؤں کے ساتھ ملتے تو تب بھی وہ اقلیت میں ہی ہوتے لیکن اس سے بچنے کے لیے انھوں نے ہندوؤں سے کئی وعدے لیے کہ آزادی کے بعد انھیں سکھ مذہب کی بنیاد پر ایک الگ صوبہ بنانے کی اجازت ہو گی۔ سکھ اپنے دھرم اور راج نیتی میں کوئی فرق نہیں سمجھتے تھے۔

میں نے بجھن صاحب سے کہا کہ اگر ہم تاریخ میں ہم چلے گئے تو بہت وقت لگ جائے گا۔ میں آپ سے صرف یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ جب یہ فیصلہ ہو گیا تھا کہ ہندوستان تقسیم ہوگا اور پنجاب کی تقسیم کا فیصلہ ہونا باقی تھا تو اس وقت ماسٹر تارا سنگھ، سکھوں کے لیڈر، نے قائدِاعظم کی آفر کو ٹھکرایا اور ہندوؤں کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا اور میرے علم کے مطابق اس وقت پوری سکھ قوم بھی ان کے ساتھ کھڑی تھی۔ انھوں نے ایسا کیوں کیا؟ سکھوں کی ہندوؤں سے دوستی ایک تاریخی غلطی تھی اس لیے کہ ہندو اپنے اندر دیگر مذاہب کو سموتے آئے ہیں۔ اس لیے ان کا یہ خیال تھا کہ وہ سکھوں کو بھی اپنے اندر سمو لیں گے، جو غلط ثابت ہوا۔ سنتھیا کیپلی محمود نے اپنی کتاب Sikh Rebellion and the Hindu Concept of Order میں اس موضوع پر بڑی تفصیل سے لکھا ہے۔

بھجن صاحب کا جواب کچھ یوں تھا،

تقسیم ہند کے وقت سکھوں کو کسی کے ساتھ تو ملنے کا فیصلہ کرنا ہی تھا لہٰذا انھوں نے بھارت کے ساتھ ملنے کا فیصلہ کیا۔ اس کی تین بڑی وجوہات تھیں۔ پہلی یہ کہ سکھ دھرم بہت حد تک اسلام کی نسبت ہندو دھرم کے قریب ہے۔ کسی بھی مسلمان نے کبھی بھی سکھ دھرم اختیار نہیں کیا۔ اس کے برعکس بے شمار ہندو ضرور سکھ دھرم میں شامل ہوئے۔ دوسری وجہ سکھوں کی ماضی قریب میں مسلمانوں کے ساتھ جنگیں ہیں جو وہ کبھی بھی نہیں بھول پائے۔ تیسری اہم وجہ یہ تھی کہ سکھ بڑی تعداد میں کانگرس میں شامل تھے، کوئی بھی سکھ مسلم لیگ میں شامل نہیں تھا۔ کانگرس اول تو تقسیم پر راضی نہ تھی لیکن وہ لوگ یہ چاہتے تھے کہ کچھ بھی ہو مشرقی پنجاب پاکستان میں شامل نہیں ہونا چاہیے۔ پنجاب کی سرحد دہلی کے تین اطراف تک پھیلی ہوئی تھی اور اگر ایسا ہو جاتا تو یہ بھارت کے دفاع کے لیے خطرناک تھا۔ اس لیے کانگرس نے طے کیا کہ جیسے بھی ہو انھیں سکھوں کو اپنے ساتھ ملانا ہو گا۔ اس کے لیے انھوں نے سکھوں سے ہر وہ وعدہ کیا جس کے پورا ہونے کا کوئی امکان بھی نہیں تھا۔ سکھ جانتے ہوئے کہ ایسا نہیں ہو گا، کانگرس کے وعدوں پر یقین کر بیٹھے۔ بہت سے لوگ اسے سکھوں کی سادگی کہتے ہیں لیکن میں اسے ہندوؤں کی ہشیاری کا نام دوں گا۔

وہ کون سے وعدے تھے اور پھر ان کا کیا بنا؟ اس بارے میں جے ایس گریوال نے اپنی کتاب Master Tara Singh in Indian History: Colonialism, Nationalism, and the Politics of Sikh Identity میں نے بہت تفصیل کے ساتھ لکھا ہے۔ اس کتاب کا اک ایک پیراراف میں یہاں نقل کر رہا ہوں۔ جس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ سکھ کیا سوچتے تھے اور جواہر لال نہرو کیا سوچ رکھتے تھے۔

Master Tara Singh issued a statement on 4 June that the 3 June Plan did not give ‘any power or status’ to the Sikhs or anything ‘safeguarding their position or interests’. The ultimate acceptance of the plan, he said, would depend on the terms of reference for the Boundary Commission. A cycle of retaliation and reprisal started before 15 August 1947ء as a prelude to an unprecedented exodus in world history. Giani Kartar Singh was thinking of reorganization of the East Punjab to form ‘a Sikh majority province’, including the princely states of the plains. But Nehru was opposed to any kind of political safeguards. His vision of India after Independence had little room for the long-cherished hopes and aspirations of the Akalis.

اس بات کا کو پر تیپال سنگھ کپور نے ٹریبون انڈیا میں اپنی ایک تحریر Master Tara Singh and partition of the Punjab میں تفصیل سے لکھا ہے۔ کپور کے مطابق جب ماسٹر تارا سنگھ 4 مارچ 1947ء کو اکالی پارٹی کے اجلاس کے بعد اسمبلی ہال لاہور سے اپنے 23 سکھ ممبرز کے ساتھ باہر آئے تو مقامی لوگوں نے پاکستان زندہ باد کا نعرہ لگایا جس کے جواب میں ماسٹر تارا سنگھ اور ان کے ساتھیوں نے " پاکستان مردہ باد کا نعرہ لگایا۔ اس کے بعد ہر جگہ یہ بات پھیل گئی کہ تارا سنگھ نے اسمبلی کی عمارت کے باہر مسلم لیگ کا جھنڈا پھاڑ دیا ہے۔ کئی لوگوں نے اس بات کی تردید بھی کی ہے لیکن اس بات کا ردِ عمل بہت شدید ہوا۔

اس کے ساتھ ہی ایک افسوس ناک واقعہ میں تارا سنگھ کے آبائی گاؤں ہریال راولپنڈی میں ان کا گھر جلا دیا گیا اور ان کے تقریباً ساٹھ عزیزوں کو قتل کر دیا گیا۔ اس واقعے کے صرف چار دن بعد ماسٹر تارا سنگھ نے پنجاب کی تقسیم کا مطالبہ کر دیا۔ جس پر مغربی پنجاب میں فسادت کی آگ بھڑک اٹھی جسے بجھانے کی اول تو کسی نے کوشش نہیں کی اور اگر کی بھی تو کامیاب نہ ہو سکی۔

تارا سنگھ نے ایک طرف تو نقل مکانی اور جائداد کے تبادلے کے حق میں بیان دیا اور ساتھ ہی پاکستان میں ہندو اور سکھ آبادی کی حفاظت کی خاطر جناح صاحب کو درخواست کی۔ مہاتما گاندھی، نہرو اور مولانا آزاد نے ماسٹر کی اس تجویز کی مخالفت کی۔ لیکن ماسٹر تارا سنگھ ڈٹا رہا۔ اس نے اس موقع پر لوگوں کی جان و مال کے دفاع کے لیے سکھ جوانوں کے کئی جتھے بھی تیار کیے لیکن سب بے سود ثابت ہوا۔ اس کا ایک نعرہ پنجاب میں آگ لگانے کا سبب بنا۔

یہ سب جان کر میں اس نتیجے پر پہنچا کہ پنجاب کی تباہی میں سب سے بڑا کردار ماسٹر تارا سنگھ کا رہا ہے۔ میں اس کے ساتھ ساتھ باقی ہندو، سکھ اور مسلمان لیڈروں کو بھی کوئی کلین چٹ دینے کو تیار نہیں ہوں۔ ان میں سے اکثر اس تباہی کے ذمہ دار ہیں؛ کوئی کم اور کوئی زیادہ۔ اس بارے میں مزید جاننے کے لیے آپ اختر حسین سندھو کے مضمون Sikh Failure on the Partition of Punjab in 1947 کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔

بشارت الٰہی کے مضمون The Sikh Dilemma: The Partition of Punjab 1947 میں بھی اس بارے میں تفصیل سے لکھا گیا ہے۔

بھجن لال صاحب کی بات سن کر اور کئی کتابوں کے مطالعے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ مشرقی پنجاب اور کشمیر کے بغیر بھارت ایک ادھورا ملک تھا جو کسی بھی طور پر ہندوؤں کو قبول نہ تھا۔ دونوں سے کئی وعدے کیے گئے جو کبھی وفا نہ ہوئے۔

بجھن صاحب کی بیوی ہمیں تیسری مرتبہ چائے پلا چکی تھی۔ اب جانے کا وقت ہو رہا تھا لیکن بجھن صاحب کا دل ابھی مزید باتیں کرنے کا تھا۔ جس گھر میں بچے ساتھ نہ رہتے ہوں اور وہاں کوئی مہمان آجائے تو لوگ اسے جلدی رخصت نہیں کرتے۔۔۔

وہ مہمان ان کی تنہائی دور کرنے کا سبب ہوتا ہے لیکن مجھے تو جانا ہی تھا کیونکہ بچے بھی واپس آنے والے تھے۔ میری ہوٹل سے غیر حاضری انھیں پریشان بھی کر سکتی تھی اور کسی شک میں بھی ڈال سکتی تھی۔ اٹھنے سے پہلے میں نے ان سے آخری سوال کیا کہ تقسیم کے بعد سکھوں کے ساتھ کیا سلوک کیا گیا، ماسٹر تارا سنگھ نے اپنے دھرم کی خلاف ورزی کرتے ہوئے مرن ورت کیوں رکھا؟ وہ سکھوں کے ایک ناپسندیدہ شخص کیسے بن گئے؟

میرے سوال کے جواب میں انھوں نے کچھ یوں کہا کہ

ماسٹر تارا سنگھ 1885ء میں راولپنڈی کے ایک کھتری خاندان میں پیدا ہوئے۔ وہ پیدائشی سکھ نہیں تھے۔ انھوں نے خالصہ کالج، امرتسر سے گریجویشن کی اور ایک سکھ سکول میں ٹیچر کے طور پر عملی زندگی کا آغاز کیا۔ "ماسٹر" کا لفظ اسی وجہ سے استعمال کیا جاتا ہے۔ ان کی زندگی کا ایک بڑا مقصد تھا۔ وہ اپنی زندگی میں چودہ مرتبہ جیل گئے۔

بھجن صاحب نے بات سمیٹتے ہوئے کہا کہ اصل حقیقت یہ ہے کہ اگر تقسیم ہند سے پہلے سکھ کوئی بھی مطالبہ کرتے تو کانگرس اسے پورا کرنے کا وعدہ ضرور کرتی، یہ

جانتے ہوئے بھی کہ وہ وعدہ پورا نہیں کر سکیں گے۔ سکھوں کی خوشنودی کی خاطر سب کچھ کرتے، لیکن جب تقسیم ہو گئی تو پھر کوئی بھی وعدہ پورا نہ کیا گیا۔ اس پر جب ماسٹر صاحب نے احتجاج کیا تو انھیں گرفتار کر لیا گیا۔

پھر ایک دفعہ ماسٹر صاحب نے اپنے ساتھیوں سمیت بھوک ہڑتال بھی کی۔ پھر ایک مرتبہ وعدے کیے گئے۔ جو دوبارہ پورے نہیں ہوئے۔ جس کی وجہ سے ماسٹر صاحب پر سکھوں کی طرف سے تنقید بھی ہوئی اور انھیں سکھوں کی اپنی قائم کردہ ایک عدالت میں بھی پیش ہونا پڑا۔ ایک طویل جدوجہد کے نتیجے میں پنجاب صوبہ تو بن گیا لیکن آزادی کا وہ خواب پورا نہیں ہوا۔ ایک دفعہ پھر بھنڈراں والا کی قیادت میں تحریک چلائی گئی جو کامیاب نہیں ہوئی۔ آگ بجھی نہیں ہے، سلگ رہی ہے لیکن اس کی تپش میں کمی آ رہی ہے۔

نئی نسل اب پیچھے کی بجائے آگے کا سوچ رہی ہے۔ مذہبی جنونی اب بھی اپنا جھنڈا لہرا رہے ہیں۔ بھارت دشمن طاقتوں کو ان کی مدد بھی حاصل ہے لیکن کوئی بڑی تبدیلی نظر نہیں آ رہی۔ یہ کہہ کر انھوں نے مجھے رخصت کرنے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ میں نے ان کی بیوی کی چائے کی اور چٹ پٹے سموسوں کی تعریف اور سیڑھی اتر کر نیچے آ گیا۔ اگر آپ تقسیم ہند اور مشرقی پنجاب ،جو کہ متحدہ پنجاب کے 38 فیصد رقبے اور 45 فیصد آبادی پر مشتمل تھا، جس میں ساٹھ فیصد سے زیادہ ہندو اور پینتیس فیصد سکھ آباد تھے، سے متعلق مزید جاننا چاہیں تو ایس ایس بل کی کتاب PUNJAB AFTER INDEPENDENCE (1947-1957) ضرور دیکھیں۔

اجمیر سنگھ سکھ تاریخ کے معروف ماہر ہیں۔ انھوں نے کتاب "اک غلامی سے دوسری غلامی تک "کے علاوہ بھی کئی کتابیں لکھیں ہیں۔ ابھی حال ہی میں انھوں نے 1984ء ھولوکاسٹ کے نام سے بھی ایک کتاب لکھی ہے۔ میں ان کتابوں کا انگلش یا

اردو ترجمہ نہیں دیکھ سکا۔ نام سے کچھ اندازہ ہو جاتا ہے کہ کتاب میں کیا لکھا ہو گا۔ میں نے وہ کتاب پڑھی تو نہیں لیکن کوشش ہے کہ کہیں سے مل جائے، ملی تو ضرور پڑھوں گا۔

آزادی ہند یا تقسیم ہند

انگریزوں سے آزادی کے متعلق میں جو سمجھ سکا ہوں اس کے مطابق یہ آزادی ہند نہیں ہے، یہ تقسیم ہند ہے۔ انگریز یہاں سے جانا چاہتے تھے، لیکن ہند کو کمزور کر کے۔ کمزور کرنے کے لیے تقسیم ضروری تھی، تقسیم بھی ایسی کہ آپس میں جنگ اس خطہ کا مقدر ہو، جنگ ہو گی، تو معاشی ترقی نہیں ہو گی، معاشی غلامی، ان کے مفاد میں ہے، اب ہم تین آزاد ملک ہیں، لیکن بر سرِ پیکار، تینوں کے پاس ان ہی کا دیا ہوا اسلحہ ہے، ان ہی سے لیے گئے قرضے ہیں، انہی کے کہنے پر چل رہے ہیں۔

وہ کیوں جانا چاہتے تھے، کیا ہمارے کہنے پر گئے ہیں یا حالات ہی ایسے ہو گئے تھے۔ میرے خیال میں ان کے جانے کی وجوہات کچھ یوں ہیں۔

- جنگ عظیم دوم کے بعد ان کے معاشی اور فوجی طاقت میں کمی واقع ہونا
- دنیا بھر میں آازدی کی تحریکوں کا چلنا اور کامیاب ہونا، افریقہ کے کئی ممالک کی آزادی، جاپان کے زیرِ قبضہ ممالک کی آزدی
- ہندوستان بھر میں کئی لوگوں نے بندوق کا سہارا لیا، غدر پارٹی بنی، آزاد ہندوستان کی فوج سبھاش چندر کی قیادت میں، ان سب نے مل کر انگریزوں کے لیے مسائل پیدا کیے

- دو طاقتور اور عوامی سیاسی جماعتوں کا قیام اور ان کی دن بدن بڑھتی ہوئی عوامی طاقت
- دنیا بھر میں جمہوریت کی تحریک
- ایک وسیع و عریض ملک پر لندن سے بیٹھ کر حکومت کرنا
- تعلیم کا عام ہونا، پریس کی آزدی

یہ سب دیکھ کر انھوں نے طرزِ حکمرانی میں تبدیلی کا فیصلہ کیا اور بندوق کی بجائے، ڈالر اور پونڈ، ایک مشترکہ مغرب، ٹیکنالوجی کی برتری، معاشی اور معاشرتی بالادستی، بین الاقوامی اداروں کا قیام، جیسے ہتھیار استعمال کرنے کا فیصلہ کیا اور خوب کیا۔

اب بھی ہم غلام ہیں، نہیں یقین تو اپنے حکمرانوں بھلے وہ فوجی ہوں، بیوروکریسی میں ہوں، سیاست میں ہوں، معیشت کے بڑے ہوں، معاشرے کے بااثر لوگ ہوں، مذہبی پیشوا ہوں، ان کی اکثریت کی جیبوں میں مغربی ممالک کے پاسپورٹ میری اس بات کی گواہی کے لیے کافی ہیں کہ اب بھی ہم پر وہ لوگ ہی مسلط ہیں، جو بظاہر تو ہمارے ملک سے ہی تعلق رکھتے ہیں، لیکن وہ انگریزوں کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے ہم سے ایک غلام کی طرح کا سلوک کرتے ہیں۔

وہ عوام کے خدمتگار نہیں، بلکہ حاکم ہیں بالکل اسی طرح، جس طرح انگریز کرتا ہے، سوائے رنگ کے اور کوئی فرق نہیں ہے۔ اس سے نجات کا ذریعہ کیا ہے؟

میرے نزدیک

معاشی آزادی ہی اصل آزادی کی ضمانت ہے!

At the conference in New Delhi where Lord Mountbatten disclosed Britain's partition plan for India.(Getty Images) Photo Credit: https://www.hindustantimes.com

India Post Stamp

Photo Credit: https://en.wikipedia.or

احمد چیمہ نہیں جا سکتا

آج 15 جون 2005ء کا دن تھا۔ ہم سات جون کو بھارت آئے تھے اور آج ہمارے جانے کا دن تھا۔ ایک ہفتہ خیریت سے گزرا، بچے خوش تھے، میں اور عرفان صاحب بھی بے حد خوش تھے اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کر رہے تھے۔ ہم صبح وقت پر بس اسٹینڈ پہنچ گئے۔ حسب معمول پولیس کے دستے نے سارے راستے ہماری بس کی حفاظت کی۔ ہم ایک جگہ چائے اور ایک جگہ کھانے کے لیے رکے۔ شام کے تقریباً چار بجے ہم اٹاری آ گئے۔

کسٹم، پولیس، امیگریشن کے لوگوں کی موجودگی میں تمام کام ہو رہا تھا۔ میز کرسی بچھائے ایک پولیس انسپکٹر ہمارے کاغذات کی جانچ پڑتال کر رہے تھے۔ سب باری باری ان کے پاس جا رہے تھے۔ ہمارے ایک نہایت پیارے بچے احمد چیمہ جب ان کے پاس گئے اور اپنا پاسپورٹ دکھایا۔ انسپکٹر صاحب، جو ایک سکھ سردار تھے ان کی عمر پچاس سال کے قریب ہو گی اور انھوں نے پگڑی باندھ رکھی تھی وہ کافی صحت مند آدمی تھے، نے احمد چیمہ کا پاسپورٹ دیکھنے کے بعد کہا کہ احمد چیمہ نہیں جا سکتا۔

میں ذرا فاصلے پر کھڑا تھا۔ مجھے آواز تو نہ آئی لیکن مجھے محسوس ہوا کہ کوئی انہونی بات ضرور ہوئی ہے۔ جو بچے قریب کھڑے تھے میں نے ان سے پوچھا کہ کیا بات ہے؟ تو انھوں نے بتایا کہ سردار صاحب کہہ رہے ہیں کہ احمد چیمہ نہیں جا سکتا۔ یہ سننا تھا کہ ہم سب کے رنگ فق ہو گئے۔ بظاہر احمد چیمہ نے کوئی ایسی حرکت نہیں کی تھی جس کی وجہ سے ہمیں محسوس ہو کہ وہ پولیس کو مطلوب ہے لیکن چند لمحوں کے لیے ہم سب لوگوں کی زبانیں گنگ ہو گئیں۔ سب کے چہروں پر ایک رنگ آ رہا تھا اور دوسرا جا رہا تھا۔ سبھی پریشان تھے۔ سامنے پاکستان کا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ ہمارا سامان بھی دوسری طرف پہنچایا جا رہا تھا۔ بس کے دیگر مسافر بھی اپنے کاغذات دکھا رہے تھے کہ اچانک سردار صاحب کا یہ حکم سنائی دیا، جو سمجھ سے بالاتر تھا۔

آپ یہ تصور کریں کہ آپ ایک ایسے ملک میں ہوں جن سے آپ کے تعلقات بھی ٹھیک نہ ہوں اور وہاں کا پولیس آفیسر آپ کو یہ کہے کہ آپ کا ایک ساتھی نہیں جا سکتا، باقی جا سکتے ہیں، ہماری کیا حالت ہو گی؟

میں نے ہمت کرکے آگے جا کر سردا صاحب سے پوچھا کہ سردار صاحب، احمد نے کیا جرم کیا ہے کہ آپ انہیں نہیں جانے دینا چاہتے۔ میں کچھ اور کہنا چاہ رہا تھا کہ انھوں نے مجھے ہاتھ کے اشارے سے کہا کہ چپ ہو جاؤاور میں چپ ہو کر دور کھڑا ہو گیا۔

اب صورت حال یہ تھی کہ سردار صاحب ہال کے درمیان میں کرسی میز ڈالے بیٹھے ہیں۔ لوگوں کے کاغذات چیک کیے جا رہے ہیں اور ہم ہیں کہ خوف کے مارے ہمارے دل سینوں میں چپک گئے ہیں اور دلوں نے دھڑ کنا بند کر دیا ہے۔ نہ کوئی بول رہا ہے نہ ہنس رہا ہے۔۔۔ ساری خوشیاں غارت ہو گئیں۔ دل ہی دل میں سب دعائیں کر رہے تھے۔ سب کی بری حالت تو تھی ہی لیکن احمد کی یقینی طور پر سب سے زیادہ تھی۔ کوئی پرسان حال نظر نہیں آ رہا تھا۔ کچھ دیر بعد میں نے دیکھا کہ سردار صاحب کچھ لمحے بعد سر اٹھا کر ہماری طرف دیکھتے ہیں، خاص طور پر احمد اور میری طرف اور پھر نظریں جھکا لیتے ہیں اور پھر سے دیگر لوگوں کے کاغذات دیکھنے لگ جاتے ہیں۔ ہمارے پاس دعا کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔

سردار صاحب دو تین مرتبہ دیکھنے کے بعد مجھے پریشان دیکھ کر ہلکا سا مسکرائے۔ ان کی مسکراہٹ کے جواب میں میں نے بھی ایک پھیکی سی مسکراہٹ سے ان کی طرف دیکھا۔ اس سے مجھے کچھ امید ہوئی کہ کوئی خاص بات نہیں ہے۔ ایسی حالت میں ان کا مسکرانا بنتا نہیں تھا اگر وہ مسکرائے ہیں تو کوئی بہت بڑا مسئلہ نہیں ہوگا۔ جب وہ سب لوگوں سے فارغ ہو گئے، تو انھوں نے احمد کو بلوایا اور کہا کہ تم ذات کے چیمہ جاٹ ہو؟ احمد نے کہا جی میں چیمہ جاٹ ہوں۔ انھوں نے کہا کہ تم سب سے پہلے پاکستان کی سرحد عبور کرو گے۔

یہ بات سن کر سب کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو آ گئے۔

سرادر صاحب ہمیں خوش دیکھ کر بولے میرا ننھال چیمہ ہے اس لیے مجھے چیمہ لوگ بہت پسند ہیں۔احمد کے نام کے ساتھ چیمہ دیکھ کر مجھے اپنے نانا اور ماموں یاد آ گئے جس کی وجہ سے میں نے اسے شرارت کے طور پریشان کرنے کا سوچا۔ میں معافی چاہتا ہوں میں نے آپ کو پریشان کیا۔ یہ میں نے اس لیے بھی کیا ہے کہ آپ بچے بھی ہیں اور جوان بھی۔ بوڑھے جوانوں کے ساتھ مذاق کرکے کچھ دیر کے لیے خود بھی جوان ہو جاتے ہیں۔ انھوں نے ہم سب سے ہاتھ ملایا۔ احمد چیمہ سے گلے ملے اور سب کو پیار بھری نظروں سے رخصت کیا۔۔۔ میں کچھ قدم چل کر واپس ان کے پاس گیا اور کہا کہ سرادر جی چیمہ لوگوں کا آبائی وطن، سیالکوٹ، گجرات، گوجرانوالہ ہے،آپ بھی؟

میرا یہ کہنا تھا کہ انھوں نے جیب سے رومال نکالا اور کہا جامکے چیمہ ڈسکہ میں ان کے نانا کی حویلی اب بھی موجود ہے۔۔۔ میری ماں کے پاس اس حویلی کے دروازے کی ایک اینٹ اب بھی موجود ہے۔۔۔ اس نے اپنے گہنے چھوڑ دیے لیکن اپنے بابل کی حویلی کی ایک اینٹ ضرور اٹھا لائی ۔۔ کیونکہ اس اینٹ پر اسکے جوان بھائی کے خون کے قطرے تھے۔۔۔ وہ لاش تو نہ اٹھا سکی۔۔ اسکے خون کی چند بوندیں ہی لے آئی۔ یہ کہہ کر سردار جی نے منہ دوسری طرف کیا اور اپنی جیب سے نکالے رومال کو دونوں ہاتھوں میں لے لیا۔ میں نے اپنا رومال تلاش کیا اور یاد کرنے لگا کہ میری ماں تو اپنے جوان بھائی کی لاش بھی اٹھا نہ سکی اور نہ ہی خون کی چند قطروں والی اینٹ، وہ تو اپنے بھائی کی چند ماہ کی یتیم بیٹی کو ہی گود میں لے کے فیروزپور روڈ پر چلتی ہوئی قصور کے قریب ایک گاؤں پہنچی تھی،۔۔۔

سردار کی ماں تو میری ماں سے زیادہ خوش نصیب تھی۔۔۔

ایک کام کا اختتام ہوا۔

یہ سفر نامہ میں تین سال سے لکھ رہا ہوں۔ میں آج دو مئی 2022ء کو اس سفر نامے کی آخری سطور لکھ کر رہا ہوں۔ میں نے سفر نامے کو اس انداز سے لکھنے کی کوشش کی ہے کہ اس میں ان علاقوں کی، جہاں سے مجھے گزرنے کا اتفاق ہوا ہے، زیادہ سے زیادہ تاریخ، جغرافیہ، معیشت اور معاشرت کے بارے میں آپ کی خدمت میں کچھ معلومات پیش کروں۔ میں اس میں کہاں تک کامیاب ہوا ہوں، اس کا فیصلہ آپ خود کر سکتے ہیں۔ میں بس اتنا کہہ سکتا ہوں کہ میں نے یہ کام کرنے کے لیے محنت کرنے میں کوئی کنجوسی نہیں دکھائی اور نہ ہی چیزوں کو ایک خاص نقطہ نظر سے دیکھا ہے۔

واقعات لکھنے کی کوشش کی ہے۔ ان واقعات کے پیچھے کیا چھپا ہوا تھا وہ بتانے کی کوشش نہیں کی۔ بہت ہی کم مقامات پر اپنی رائے دی ہے۔ کسی بھی واقعے پر مختلف آرا بھی سامنے رکھیں ہیں۔ میں نے پوری کوشش کی ہے کہ کسی کے مذہب کے بارے میں کوئی گستاخی نہ ہو جائے۔ اگر کہیں ایسا ہو گیا ہو تو معافی کی درخواست ہے۔ اگر آپ کوئی بات خلاف حقیقت پائیں تو مجھے ضرور مطلع کریں، اسے درست کرنے کی پوری کوشش کی جائے گی

یہ سفر نامہ قسطوں کی صورت میں فیس بک پر مسلسل شائع ہوتا رہا ہے۔ اس کی کل 170 اقساط ہیں۔ اب یہ چار کتابوں کی شکل میں آپ کے سامنے پیش ہے۔

میری اللہ تعالی سے دعا ہے کہ اللہ تعالی اس کتاب کو پڑھنے والوں کے لیے مفید بنائے اور یہ میرے لیے صدقہ جاریہ ثابت ہو۔

آمین ثم آمین
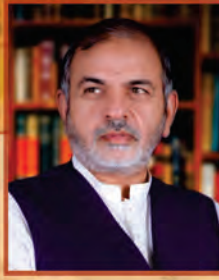
تقسیم ہند کے بعد پیدا ہونے والی صورتِ حال نے کئی خاندانوں کو اُنکے آبائی علاقوں سے ہجرت پر مجبور کر دیا اور اُنھی بد قسمت لوگوں میں ایک میرا خاندان بھی شامل تھا جو موجودہ بھارت کی ریاست پٹیالہ کے شہر سرہند سے ہجرت کر کے ٹوبہ ٹیک سنگھ سکونت پذیر ہوئے۔ میری پیدائش 15 مارچ 1958ء کو ٹوبہ ٹیک سنگھ میں ہوئی۔ میں نے ٹوبہ ٹیک سنگھ اور فیصل آباد میں انٹرمیڈیٹ تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد اعلیٰ تعلیم کیلئے Textile کے شعبے کا انتخاب کیا اور 1981ء میں نیشنل کالج سے Textile Engineering کی ڈگری مکمل کی۔ اپنی مہارت کو مزید تقویت دینے کیلئے میں نے مختلف ملازمتوں سے تجربہ حاصل کیا اور 1992ء کے بعد سے اپنے ذاتی کاروبار کا آغاز کیا۔ مسلسل سیکھنے کے اصول پر کارفرما رہتے ہوئے میں نے اپنے انتہائی مصروف اوقات میں سے وقت نکال کر 2001ء میں University of Management Technology سے MBA میں گولڈ میڈل بھی حاصل کر لیا۔

علم کا اشتیاق بڑھا تو 2008ء میں The University of Manchester سے MPhil اور 2012ء میں Czech Republic کی معروف یونیورسٹی سے Textile میں PhD بھی کر لی۔

کاروباری مصروفیات کے ساتھ ساتھ میں کئی فلاحی اداروں (غزالی ایجوکیشن ٹرسٹ، الخدمت فاؤنڈیشن پاکستان اور تعاون فاؤنڈیشن) سے بھی منسلک رہا اور یہ سلسلہ آج تک قائم ہے۔

اس کتاب کا مواد کئی مُستند تاریخی حوالوں سے حاصل کیا گیا ہے اور حتی الامکان کوشش کی گئی ہے کہ اُنھی حالات وواقعات کو بیان کیا جائے جن پر اجماع کثیر ہو لیکن پھر بھی اگر کسی تاریخ یا واقعے میں کوئی تضاد پایا جائے تو ہر حال میں اسکی اصلاح کی گنجائش موجود ہے۔

ISBN 978-996-9522-54-1

9 789969 522541

اس کتاب سے حاصل ہونے والی تمام آمدنی غزالی ایجوکیشن ٹرسٹ کے بچوں کی تعلیم وتربیت پر خرچ کی جائے گی۔ انشاءاللہ